**عیار غالب** ۔ مرتبہ جناب مالک رام صاحب تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۲، مجلد قیمت معہ، پتہ علمی مجلس دلی ۶

غالب صدی کی تقریب کے موقع پر علمی مجلس دہلی نے اپنے سہ ماہی رسالہ "تحریر" کا پہلے غالب نمبر شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا، پھر افادیت کے خیال سے اس کے بجائے اس کو کتابی صورت میں شائع کیا، یہ غالب کے متعلق بارہ مقالات اور ان کی مشہور فارسی مثنوی "چراغ دیر" کے منظوم اردو ترجمہ پر مشتمل ہے۔ دو مضامین خود فاضل مرتب کے قلم سے ہیں، ان میں "غالب شناسی جب اور اب" قابل ذکر ہے، جس میں اس عام خیال کی تردید کی گئی ہے کہ غالب کی انکے زمانہ میں قدر نہیں ہوئی، مولوی ضیاء احمد صاحب بدایونی نے غالب کے نعتیہ کلام پر روشنی ڈالتے ہوئے نعت گوئی کی اجمالی تاریخ بھی تحریر کی ہے، "غالب کا نفسیاتی مطالعہ" (ڈاکٹر نریندر ناتھ دگ)، اور "غالب کی بیماریاں" (ڈاکٹر عبد الجلیل) خصوصیت سے زیادہ دلچسپ اور نئے طرز کے مضامین ہیں، مشاہیر میں فراق گورکھپوری، سید مسعود حسن رضوی اور قاضی عبد الودود وغیرہ کے مضامین بھی درج ہیں، مجموعی حیثیت سے یہ کتاب غالبیات میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

"ض"

---

## فارم IV

(دیکھو رول نمبر ۸)

معارف پریس اعظم گڈھ

| | |
|---|---|
| نام مقام اشاعت | دار المصنفین اعظم گڈھ |
| نوعیت اشاعت | ماہانہ |
| نام پرنٹر | صدیق احمد |
| قومیت | ہندوستانی |
| پتہ | دار المصنفین اعظم گڈھ |
| نام پبلشر | " " |
| قومیت | ہندوستانی |
| پتہ | دار المصنفین اعظم گڈھ |
| اڈیٹر | شاہ معین الدین احمد ندوی |
| قومیت | ہندوستانی |
| پتہ | دار المصنفین اعظم گڈھ |
| نام و پتہ مالک رسالہ | |

میں صدیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ صدیق احمد

جلد ۱۰۵ ماہ صفر المظفر ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۷۰ء عدد ۴

## مضامین

# شذرات

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے، وہ کسی نسل، قوم اور ملک و وطن میں محدود نہیں اسلیے اس نے مسلمانوں میں وحدت کی بنیاد قومیت اور وطنیت کے بجائے عقائد و افکار کے اتحاد اور اسلامی اخوت پر رکھی، کیونکہ مختلف نسلوں، قوموں اور ملکوں کے مسلمانوں کے درمیان جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل کی دوری پر رہتے ہیں، اور جن کی قومی خصوصیات اور ملکی مصالح جدا جدا ہیں، اسکے سوا اتحاد اور اشتراک کا اور کوئی رشتہ ہو ہی نہیں سکتا تھا، اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو لیبیا اور انڈونیشیا کے مسلمانوں کو افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے، عربوں سے یہ تعلق اس بنا پر اور گہرا ہے کہ مسلمانوں کے مذہب کا سرچشمہ عرب ہے، "اسلام کے اولین مبلغ عرب تھے،" ان کا قبلہ عرب میں ہے اور انکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آرام گاہ عرب ہی ہے، اس لیے جو لوگ اسلامی اخوت اور اسلامی اتحاد کی مخالفت کرتے ہیں، وہ درحقیقت مسلمانوں کی وحدت کو ختم اور عربوں کو ان کی ہمدردی سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔

---

قومیت سے انکار نہیں اگر اس کو اسکی حد کے اندر رکھا جائے تو وہ بھی ایک حقیقت ہے، مگر قوم پرستی اور وطن پرستی مذہب کو بہا لیجاتی ہے جس کا تجربہ عرب ملکوں میں ہو رہا ہے، لیکن قومیت صرف ایک ملک اور ایک حکومت کے باشندوں میں جن کے مصالح یکساں ہوں، اتحاد پیدا کر سکتی ہے، مختلف حکومتوں کے باشندوں میں خواہ وہ نسلاً ایک ہوں مگر انکے مصالح جدا جدا ہوں، اتحاد نہیں پیدا کر سکتی، جس کا ثبوت عرب حکومتوں کا اختلاف ہے اور قومیت کا نعرہ آجتک ان کو متحد نہیں کر سکا، ان کے اتحاد کا ذریعہ آج بھی مذہب ہی ہے،



جس کا اب عربوں کو بھی احساس ہو چلا ہے، رباط اور اس کے بعد جدہ کانفرنس اسی کا نتیجہ ہے، صدیوں کے بعد یہ موقع آیا ہے کہ اسلامی ملک ایک مقصد کے لیے ایک جگہ جمع ہوئے اور اپنے اتحاد و تنظیم کے لیے ایک ادارہ کی بنیاد رکھی، یہ نہایت مبارک قدم اور مسلمانوں کے مستقبل کے لیے فال نیک ہے، جو عرب ابتک قومیت کے نشہ میں سرشار اور کمیونزم کے طلسم میں گرفتار ہیں وہ اسکو ناکام بنانے کی پوری کوشش کرینگے، لیکن اگر یہ تنظیم مستحکم ہو گئی تو وہ بھی اس میں شرکت کیلئے مجبور رہینگے۔

---

درحقیقت اسلامی اتحاد و تنظیم نہ کوئی خطرہ کی چیز ہے اور نہ کسی کے خلاف جتھابندی ہے، بلکہ وہ اسلام کے ایک حکم کی جو مسلمانوں کی وحدت کا سنگ بنیاد اور خود اسلامی حکومتوں کے مصالح کے لیے ضروری ہے، تعمیل ہے، اتحاد اسلامی کا ہوّا تو مغربی قوموں نے کھڑا کیا ہے، انھوں نے مسلمانوں کے اتحاد اور عثمانی خلافت کی مرکزیت کو ختم کرنے کیلیے اسکے خلاف اتنا پروپیگنڈا کیا کہ عرب خاص طور سے اس کا شکار ہو گئے، جس کا نتیجہ ان کے حق میں مہلک نکلا اور وہ ایک متحدہ طاقت کے بجائے چھوٹی چھوٹی کمزور ریاستوں میں بٹ گئے، اگر انھوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت نہ کی ہوتی تو ان کی طاقت اس طرح پراگندہ نہ ہوتی، اس میں ترکوں کی بھی غلطی تھی، جس کا خمیازہ ان کو بھگتنا پڑا، اب اس تنظیم کی مخالفت بے نتیجہ ہے، حکومت ہند کو اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے، متحدہ ہندوستان میں یہاں کے مسلمانوں کا ہمیشہ اسلامی ملکوں میں ایک وزن رہا ہے، اب بھی ہندوستان میں انکی تعداد چھ کرور ہے، انڈونیشیا اور پاکستان کو چھوڑ کر مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد کسی اسلامی ملک میں بھی نہیں ہے، اس لیے کوئی اسلامی تنظیم ان کو نظر انداز نہیں کر سکتی اور ان کے ذریعہ حکومت ہند اس تنظیم سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

---

دار المصنفین کے تعلقات عرب ملکوں کے بعض علمی اداروں سے ہیں اور وہ اپنی مطبوعات ہدیۃً بھیجے ہیں، لیکن ایران کے کسی علمی و تعلیمی ادارہ سے ابتک کوئی رابطہ نہیں تھا، اس لیے ان کی تصانیف اور مطبوعات کا بھی علم نہ ہوتا تھا، وہاں کے ایک فاضل ڈاکٹر شہریار نقوی استاد دانشکدۂ الہیات و معارف اسلامی تہران یونیورسٹی نے جو ہندوستان میں رہ چکے ہیں اور دار المصنفین سے واقف اور اس کے قدر دانوں میں ہیں تہران یونیورسٹی کی پچاس مطبوعات دار المصنفین کو ہدیۃً بھجوائی ہیں، یہ کتابیں مختلف فنون کی اور اعلیٰ کاغذ و طباعت سے آراستہ ہیں، آیندہ کسی پرچہ میں ان کا تفصیلی ذکر کیا جائے گا، جو کتابیں ہمارے پاس آئی ہیں ان کے سلسلۂ مطبوعات کا نمبر چودہ سو سے اوپر ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تہران یونیورسٹی تعلیم کے ساتھ کتنا مفید علمی کام انجام دے رہی ہے، دار المصنفین اس قیمتی علمی تحفہ کے لیے تہران یونیورسٹی اور ڈاکٹر شہریار نقوی کا شکر گذار ہے، ڈاکٹر صاحب کو اردو میں پوری مہارت ہے، اور ایسی عام سلیس اردو لکھتے ہیں کہ کسی اہل زبان کی تحریر معلوم ہوتی ہے، ان کے تین خط اس نمبر میں شائع کیے جا رہے ہیں۔

---

دار العلوم ندوۃ العلماء میں بعض مفید انتظامی تبدیلیاں ہوئی ہیں، مولانا محب اللہ صاحب لاری ندوی مہتمم اور مولانا محمد اویس صاحب نگرامی ندوی نائب مہتمم مقرر ہوئے ہیں، یہ دونوں بڑی محنت اور توجہ سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، ان کے حسن انتظام سے عام طور سے اساتذہ اور طلبہ مطمئن ہیں، ابھی ڈائننگ ہال کی وسیع عمارت بنکر تیار ہوئی ہے۔ اس سے طلبہ اور منتظمین مطبخ دونوں کو بڑی سہولت ہو گئی ہے، یوں تو دار العلوم میں متعدد عمارتوں کی ضرورت ہے، لیکن طلبہ کی کثرت کی وجہ سے مسجد کی عمارت بہت تنگ ہو گئی ہے، اسکی توسیع سب سے مقدم ہے، اور اصحاب خیر مسلمانوں کو خاص طور سے اسکی جانب توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

---



# مقالات

## اردو زبان کا ترکی عنصر

از جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب سابق پروفیسر عربی پنجاب یونیورسٹی، لاہور

کئی برس کی بات ہے، میں نے پنجاب یونیورسٹی کی عربک اینڈ پرشین سوسائٹی کے ایک جلسہ میں "اردو زبان کے ترکی عنصر" ایک لکچر دیا تھا، جس کے نفس مضمون کے متعلق ایک تحریری یادداشت میرے پاس مدت سے محفوظ پڑی تھی، اور جس کی اشاعت کی آجتک نوبت نہیں آئی تھی، اب "معارف" کے دسمبر ۱۹۶۹ء کے شمارہ میں فاضل معاصر ڈاکٹر اکمل صاحب ایوبی کا عالمانہ مضمون نظر سے گزرا، جو انھوں نے "اردو میں ترکی زبان کے الفاظ" کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے، اگرچہ اس میں دو چار باتیں محل نظر ہیں، جن کی طرف اس مضمون کے آخر میں اشارہ کروں گا، بہرحال ان کا مقالہ بحیثیت مجموعی بیحد دلچسپ ہے اور مفید معلومات پر مشتمل ہے، اس کو دیکھنے سے مجھے احساس ہوا کہ بعض علم دوست احباب کو اس موضوع سے خاصی دلچسپی ہے، لہذا مذکورہ بالا لکچر کا خلاصہ موجودہ مضمون کی صورت میں ناظرین معارف کی ضیافت طبع کے لیے پیش کیا جاتا ہے،

گر قبول افتد زہے عز و شرف

اگرچہ اردو زبان اپنی صرف و نحو اور اپنے بنیادی ذخیرہ الفاظ کے اعتبار سے شمالی ہند کی پراکرت بولیوں کی طرح ایک آریائی زبان ہے، لیکن اپنے مستعمل الفاظ کے لحاظ سے اس کا

دامن بہت وسیع ہے، علاوہ اُن الفاظ کے جن کا ماخذ سنسکرت یا اس کی پراکرت بولیاں ہیں، اس میں عربی، فارسی، ترکی اور متعدد مغربی زبانوں کے الفاظ بھی بکثرت اور بلا تکلف مستعمل ہیں، اردو زبان کے اس قدر وسیع المشرب ہونے کا راز اُن تاریخی واقعات میں مضمر ہے، جو ہندوستان کی سرزمین میں رونما ہوئے، جو صاحب علم عربی، فارسی یا مغربی زبانوں سے واقف ہیں، وہ ان زبانوں کے الفاظ کو فوراً پہچان لیتے ہیں، جو اردو میں مروج ہیں، خواہ ان کی موجودہ صورت بعض اوقات اپنے اصل سے دور ہی کیوں نہ جا پڑی ہو، لیکن چونکہ اس ملک میں ترکی زبان کا علم بہت محدود ہے، بلکہ کالعدم ہے، اس لیے پڑھے لکھے لوگ بھی اس امر سے کماحقہٗ آگاہ نہیں کہ اردو زبان میں ترکی عنصر کس کثیر مقدار میں موجود ہے، لغت نگاروں نے بھی اس ترکی عنصر کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا، یعنی ترکی الفاظ کی کافی تحقیق و تدقیق نہیں کی، اور بہت سے ترکی الفاظ کو فارسی کتابوں میں دیکھ کر انھیں فارسی قرار دیدیا ہے، حتیٰ کہ مؤید الفضلاء کے فاضل مؤلف نے بھی متعدد ترکی الفاظ کو فارسی الفاظ کی فصلوں میں ڈالدیا ہے، یہی حال پلاٹس (Platts) کا ہے، جس نے اپنی اردو انگریزی ڈکشنری میں بہت سے ترکی کلمات کو فارسی یا ہندی لکھدیا ہے اور اوروں کو بھی گمراہ کیا ہے، اندریں حالات اس مضمون کی تحریر سے میرا مقصد یہ ہے کہ ناظرین کرام کی توجہ ان ترکی الفاظ کی طرف مبذول کرائی جائے، جو فی زماننا ہمارے ہاں تحریری اور تقریری طور پر بکثرت مستعمل ہیں، لیکن ان کے اصل ماخذ کے بارے میں ہم نے بہت کم دلچسپی کا اظہار کیا ہے،

جب ایک زبان کے الفاظ کسی دوسری زبان میں داخل ہوتے ہیں، تو الفاظ کا لین دین عام طور پر مختلف قوموں کے باہمی میل جول کا نتیجہ ہوتا ہے، لہٰذا موضوع سخن کی وضاحت کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ترک لوگ عالم اسلام میں بالعموم اور ہندوستان میں بالخصوص کب



اور کس طرح وارد ہوئے،

**ترکستان کی فتح** | ترکوں کو اہل اسلام کے ساتھ پہلی صدی ہجری ہی میں سابقہ پڑ چکا تھا جب خلیفہ ولید اموی کے عہد حکومت (۸۶ھ تا ۹۶ھ) میں عربوں کا مشہور اور تجربہ کار سپہ سالار قتیبہ بن مسلم دریائے جیحوں عبور کر کے ترکستان میں داخل ہوا، تو اس نے چند سالوں میں تمام ملک فتح کر لیا، اور اسے اپنے قبضہ میں رکھنے کے لیے مختلف مقامات میں متعدد چھاؤنیاں اور آبادیاں قائم کر دیں، جن کے بعض لسانی اور ثقافتی آثار کو حال ہی میں روسی مستشرقین نے دریافت کیا ہے،

**عباسی عہد خلافت** | ترکستان کی اسلامی فتح کے تقریباً سوا سو سال بعد عباسی خلیفہ معتصم باللہ (۲۱۸ھ تا ۲۲۷ھ) کا زمانہ آیا، اس وقت اسلامی فوج میں عربوں اور خراسان کے ایرانیوں کا بہت زور تھا، اور خلیفہ اُن کی سرکشی سے بہت پریشان رہتا تھا، لہٰذا اس نے فوج میں توازن پیدا کرنے کے لیے ترکوں کو بھرتی کرنا شروع کیا، اس کے علاوہ معتصم کو خلافت کی شان و شوکت بڑھانے کا بڑا شوق تھا، چنانچہ اس نے ترکوں کی شجاعت اور وجاہت دیکھ کر سمرقند، فرغانہ اور ترکستان کے دوسرے حصوں سے ہزاروں ترک لشکری فراہم کیے اور ان کو اپنی فوج میں اس کثرت سے داخل کیا کہ ان کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ گئی، اور ان میں سے جو ذاتی وجاہت اور قابلیت کے مالک تھے، خلیفہ کی خوشنودی حاصل کر کے سپہ سالاری کے منصب تک جا پہنچے، اگرچہ عربی زبان پہلے ہی سے بحد وسیع تھی، اور علمی اور سیاسی ضروریات کے لیے کافی تھی، تاہم لشکریوں کی آمد سے بہت سے ترکی الفاظ عربوں اور ایرانیوں کی زبانوں پر جاری ہو گئے، مثلاً ایلچی، بیرق اور اس کا مرکب بیرقدار، چغہ یا چوغہ (جسے عربوں نے جوخ بنا لیا) کلیق وغیرہ، اسی خلیفہ معتصم نے جب ۲۲۱ھ

میں ترک لشکریوں کے لیے بغداد کے شمال میں سامرا کے مقام پر ایک الگ چھاؤنی قائم کی اور
اسے اپنا دارالحکومت قرار دے کر وہاں اپنا محل تعمیر کرایا، تو عرب مورخوں کے بیان کے مطابق لوگ
اس قصر خلافت کو "الجوسق الخاقانی" کہتے تھے، اور یہ امر قابلِ غور ہے کہ یہ دونوں لفظ یعنی جوسق
اور خاقان ترکی الفاظ کے معرب ہیں۔

**سلاجقہ کی آمد**

دنیائے اسلام میں ایک مدت تک ترکوں کی حیثیت محض لشکریوں کی رہی،
مگر پانچویں صدی ہجری کی ابتدا میں جب عباسی خلافت کا انحطاط حد سے گزر چکا تھا،
ترک لوگ ایران میں فاتحین کی حیثیت سے داخل ہوئے، یہ سلجوقی قوم کے ترک تھے، جو چغری بیگ
اور طغرل بیگ کی سرکردگی میں پہلے خیوا کے علاقہ پر قابض ہوئے اور پھر انھوں نے خراسان
کا رخ کیا، اور سلطان محمود غزنوی کی اجازت سے وہاں آباد ہو گئے، لیکن سلطان ممدوح کی
آنکھیں بند ہوتے ہی خود مختار بن بیٹھے، اور چند سالوں میں تمام ایران پر چھا گئے، یہاں تک
کہ انھوں نے خلیفۂ بغداد کو بھی اپنی حمایت میں لے لیا۔ الپ ارسلان، ملک شاہ اور
سنجر جیسے نامور اور اولوالعزم سلاطین اسی سلجوقی خاندان سے تھے، ظاہر ہے کہ سلاجقہ کی
آمد سے بھی ترکی زبان کے اثر و نفوذ میں اضافہ ہوا ہوگا۔

**ہندستان کے ترک حکمراں**

جس زمانہ میں سلاجقہ نے خوارزم میں ظہور کیا، اسی زمانہ کے
قریب سلطان محمود ہندوستان میں اپنی فتوحات کا آغاز کر چکا تھا، جیسا کہ سب کو
معلوم ہے سلطان مذکور نسلاً ترک تھا، اور اگرچہ اس کے عساکر میں ایرانی، افغان اور
ہندو سبھی قوموں کے لوگ شامل تھے، لیکن اس کے اکثر معتمد علیہ افسر ترک ہی تھے،
جب شاہان غور نے غزنوی خاندان کو افغانستان سے بے دخل کر دیا، تو غزنوی حکمرانوں
نے پنجاب کو اپنا وطن بنایا اور اس کے صدر مقام لاہور نے بتدریج ایک اسلامی شہر کی



صورت اختیار کر لی۔

غزنویوں کے بعد ہندوستان میں جتنے مسلمان حکمراں ہوئے ہیں، ان میں سے بیشتر
ترکی النسل سے تھے، سلطان معزالدین محمد غوری جس نے دہلی اور اجمیر کے راجہ پرتھوی راج کو شکست
دے کر شمالی ہند میں اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی، اگرچہ افغان تھا، لیکن اس کا نائب قطب الدین
ایبک جس نے سلطان محمد غوری کی وفات (۶۰۲ھ) کے بعد دہلی کو اپنا دارالحکومت بنا کر
ہندوستان میں ایک مستقل اسلامی سلطنت قائم کی، نسل کے لحاظ سے ترک تھا، اور اس کے
جانشینوں سلطان التمش اور سلطان بلبن کے علاوہ خلجی اور تغلق خاندانوں کے حکمراں بھی ترک تھے،
صرف لودھی اور سوری خاندانوں کے بادشاہ افغان تھے، لیکن ان کا عہد حکومت نسبتہً بہت
مختصر ہے، اگرچہ ان تمام سلاطین کے عہد میں سرکاری اور علمی زبان فارسی تھی، تاہم ترکی زبان
کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ ان سینکڑوں ترکی الفاظ سے ثابت ہے جو اس
عہد کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں، اور جن میں سے بعض اب تک ہماری زبانوں پر جاری ہیں۔

**تاتاری عنصر**

ساتویں صدی ہجری میں تاتاریوں (یعنی مغول) کے خروج کے بعد انھوں نے
نہ صرف ہندوستان پر بار بار حملے کیے جن کا سلسلہ عہدِ غلامان سے شروع ہوتا ہے، بلکہ وہ ہندوستان
کے بعض مقامات میں آباد ہو گئے تھے، چنانچہ ملک بھر میں کئی مقامات ایسے ہیں جو آج تک مغل پورہ
یا مغل سرائے کے نام سے مشہور چلے آتے ہیں، ان میں سے ایک مغل پورہ لاہور کے مضافات میں
بھی ہے، تاتاریوں کی آمد سے بھی ہندوستان کی زبانوں میں متعدد ایسے الفاظ براہ راست
مروج ہو گئے، جو ان کی زبان کے ساتھ مخصوص تھے، مثلاً خان، آغا، بہادر، دگلا، باورچی،
چاقو، قینچی، داروغہ، قدغن، نوکر وغیرہ۔

**سلطنت مغلیہ**

سولھویں صدی کے اوائل میں بابر اور اس کے ساتھیوں نے فرغانہ سے نکل کر

کابل میں اپنی مسند حکومت بچھائی اور چند سال کے بعد ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان میں اپنی قسمت آزمائی، بابر اور اس کے ہمراہی نسلاً ترک تھے، اور ترکی زبان بولتے تھے، چنانچہ بابر بادشاہ نے اپنی توزک ترکی ہی میں قلمبند کی تھی، بابر کی آمد سے ہندوستان میں ترکی زبان کے اثر و نفوذ کو از سر نو تقویت ملی، مغل بادشاہوں نے اپنے محلات میں ترکی زبان کو بڑے اہتمام سے زندہ رکھا، چونکہ ترکی جاننے والے لوگ مثلاً تورانی امرا ہمیشہ ان کے گرد و پیش رہتے تھے، اس لیے شاہی خاندان کے افراد کو ترکی سیکھنے اور بولنے میں کوئی مشکل پیش نہ آتی تھی، شاہی محلات کے زنان خانوں میں جو اُردابیگنیاں اور قلما قنیاں پہرہ دینے اور دیگر انتظام کرنے پر مقرر تھیں وہ بھی وسطی ایشیا کے ترکی اور تاتاری قبیلوں سے فراہم کیجاتی تھیں، شاہی خاندان میں ترکی کے استعمال کی یہ روایات محمد شاہ کے عہد تک قائم رہیں، یہ رنگیلا بادشاہ غالباً ہندوستان کا پہلا مغل تاجدار تھا، جو ترکی سے بے بہرہ رہا، چنانچہ اسی لیے یہ مثل مشہور ہے کہ "بر محمد شاہ ترکی تمام شد"۔

نظام الملک آصف جاہ جو تورانی امرا کا سرخیل تھا، اور جس نے مغل بادشاہ کی نالائقی اور دربار دہلی کی مسلسل سازشوں سے تنگ آکر آخر کار ۱۱۳۲ھ (۱۷۲۰ء) میں دکن میں ایک آزاد اور خود مختار ریاست کی بنیاد رکھی، یہ امیر کبیر بھی ترکی نسل سے تھا، اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جن دنوں نادر شاہ افشار مغلوں کی شامت اعمال بن کر دہلی میں مقیم تھا، نظام الملک اس سے بعض اوقات ترکی میں گفتگو کرتا تھا، اور محمد شاہ ان کا منہ تکتا رہ جاتا تھا، اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ نادر شاہ جس قبیلہ افشار سے تھا، وہ بھی ایک ترکی قبیلہ تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی امرا بھی شاہان وقت کی قومی زبان سے دلچسپی رکھتے تھے، کچھ مدت ہوئی، مجھے ایک ترکی گرامر کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، جو مغلیہ عہد میں ایک ہندو دربار



نے ایک ہندو راجہ کی فرمائش پر فارسی میں لکھی تھی، ترکی زبان کا علم اب عملی طور پر ہندوستان اور پاکستان میں تقریباً کلیتہً مٹ چکا ہے، اور صد افسوس ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں ابھی تک اس اہم زبان کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہو سکا۔

**ترکی الفاظ کی فہرست**

اب میں ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے چند ایک ایسے الفاظ صنف وار پیش کرتا ہوں جو تحقیقی طور پر ترکی ہیں، یہ فہرست کسی طرح سے بھی مکمل نہیں کہی جا سکتی؛ بلکہ اسے محض نمونہ از خروارے تصور فرمائیے۔

اولاً خود اس زبان کا نام اردو ترکی لفظ ہے، جس کا معنی لشکر یا لشکرگاہ (کیمپ) ہے، اس لفظ کے مفہوم و معنی سے اس زبان کی ابتدا اور اس کے ترکیب پانے کے طریقہ اور محل و موقع پر بڑی قیمتی اور دلچسپ روشنی پڑتی ہے، اس لیے میں نے ذیل کے صفحات میں لفظ "اردو" پر ایک الگ نوٹ لکھ دیا ہے۔

(۲) مندرجہ ذیل الفاظ، جو مختلف رشتہ داروں کے لیے مستعمل ہیں، ترکی ہیں:۔

بابا بمعنی باپ۔ بادا بھی شاید اسی لفظ کی ہندی صورت ہے، جس میں باء واؤ سے بدل گئی ہے۔ (اطالوی زبان کا لفظ پاپا (Papa) بمعنی باپ، جس سے انگریزی کا لفظ پوپ ماخوذ ہے، لفظ بابا سے بہت مشابہت رکھتا ہے)

اَنّا بمعنی ماں۔ بعض لغت نگاروں نے انا کا معنی بے احتیاطی سے دایہ لکھ دیا ہے، یعنی وہ عورت جو دودھ پلائے، لیکن یہ اس لفظ کا اصلی لغوی معنی نہیں ہے، اس کا لغوی معنی فقط ماں ہے، اگر ایک دودھ پیتا بچہ اپنی دایہ کو انا یعنی ماں کہہ کر پکارتا ہے تو وہ معذور ہے، کیونکہ وہ اپنی حقیقی اور رضاعی والدہ میں تمیز نہیں کر سکتا، لیکن لغت نویس تو بچے نہیں، ان کو الفاظ کے اصلی اور ثانوی معنوں میں تمیز کرنی چاہیے،

ترکی میں رضاعی ماں یعنی دایہ کو "سود انا" یا "سوت اناسی" کہتے ہیں، سود یا سوت کا معنی دودھ ہے۔

باجی۔ یعنی بڑی بہن، ہندوستان اور پاکستان کے تعلیم یافتہ شریف گھرانوں میں اس لفظ کا استعمال بہت عام ہے۔

کوکلتاش۔ رضاعی بھائی۔

خَصم۔ شوہر، خاوند، ترکی میں اس کا تلفظ خصم ہے، اور اس کا معنی محض رشتہ دار ہے۔

(۳) مندرجۂ ذیل ترکی القاب بھی ملاحظہ فرمایئے:-

خان۔ ایک قدیم اور کثیر الاستعمال لقب ہے، جس کا مؤنث خانم ہے۔

خاقان۔ یعنی خان اعظم۔ ترکی لقب قاغان کا معرب ہے۔

بیگ۔ کسی قوم یا قبیلہ کا سردار، امیر کبیر۔ اس کا مؤنث بیگم ہے۔

آغا یا آقا۔ یعنی مالک یا مرد بزرگ و محترم۔ لغوی معنی "برادرِ بزرگ"۔

خاتون۔ زنِ معزز و محترم، لیڈی، اردو میں اس کی جمع خواتین مروج ہے۔ مگر جمع کا یہ صیغہ عربی طریقہ پر بنایا گیا ہے۔

پاشا۔ جو غالباً فارسی لفظ بادشاہ کا مخفف ہے۔

آفندی۔ تعلیم یافتہ اور معزز لوگوں کے لیے ازراہ احترام موسیو یا اسکوائر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ دراصل یہ یونانی کلمہ ( Authentes ) کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

(۴) ہمارے ہاں کھانے پینے کی اشیا کے لیے جو کلمات مروج ہیں، ان میں سے ذیل کے الفاظ ترکی ہیں:-



پلاؤ۔ وہ چاول جس کو گوشت یا گوشت کی یخنی ڈال کر پکایا جائے۔ پلاؤ ترکوں کا ایک مخصوص اور مرغوب کھانا ہے، جس کو وہ طرح طرح سے تیار کرتے ہیں، اس لیے ان کے ہاں پلاؤ کی کئی قسمیں پیدا ہو گئی ہیں، مثلاً عجم پلاوی، قیمہ لو پلاؤ اور مولوی پلاؤ وغیرہ۔

یخنی۔ گوشت کو پانی میں ابالنے کے بعد جو مشروب یا شوپ حاصل ہوتا ہے وہ یخنی ہے۔

قیمہ۔ وہ گوشت ہے جس کو پکانے سے پہلے ریزہ ریزہ کر لیا جائے، یہ لفظ ترکی مصدر قیمق سے مشتق ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کو ریزہ ریزہ کرنا۔

قورمہ۔ جس کی اصلی صورت قاوُرمہ ہے، وہ تلا ہوا یا بھنا ہوا مسالہ دار گوشت ہے، جو سبزی یا ترکاری کے بغیر تیار کیا جائے۔

جُغرات، دہی، اس لفظ کی اصلی صورت یُوغورت ہے، لیکن بعض علاقوں میں جغرات بھی کہتے ہیں اور فارسی کتابوں میں بیشتر یہی صورت مستعمل ہے۔

شلغم، ایک معروف ترکاری ہے، جسے انگریزی میں ٹرنپ ( Turnip ) کہتے ہیں۔

(۵) کھانے پینے کے لیے جو ظروف استعمال ہوتے ہیں ان میں ذیل کے الفاظ ترکی ہیں:-

اَیاغ۔ پینے کا پیالہ یا جام۔

ساغر۔ پینے کا پیالہ۔

چمچہ۔ ترکی میں لکڑی کی ڈوئی کو چمچاق کہتے ہیں، چمچہ اسی طرح مرخم صورت ہے۔ چمچ اور چمچی ترکی زبان میں معروف نہیں، یہ اہل ہند کی اختراع ہیں، لیکن ان کا ماخذ وہی ترکی لفظ چمچاق ہے۔

آجکل ترکی اور ایران میں چمچی کے لیے قاشق کا لفظ مستعمل ہے۔ قاشق بھی ترکی ہے۔

قاب۔ وہ بڑی رکابی یا پلیٹ جس میں کھانا کھاتے ہیں۔

بشقاب۔ ترکی میں بش کا معنی پانچ ہے، لہٰذا بشقاب وہ خوانچہ ہے جس میں مختلف کھانوں کی پانچ رکابیاں رکھی جائیں۔

کشکول۔ کاسۂ گدائی، یعنی وہ کشتی نما برتن جس میں درویش یا گداگر رنگا رنگ کے مختلف کھانے جمع کر لیتے ہیں، یہ ترکی لفظ کچکول کا معرب ہے۔

(۶) مندرجۂ ذیل الفاظ جن کا تعلق لباس یا پوشش سے ہے، ترکی ہیں:۔

چُوغہ۔ اونی کپڑے کا لبادہ، فرغل یا جبّہ۔

دُگلہ یا دگلا (تاتاری) چھوٹی آستینوں والا کوٹ۔

قلپاق۔ وہ کلاہ یا ٹوپی جس کے اندر سمور یا بھیڑ کی کھال لگائی جائے۔

تکمہ۔ گھنڈی یا بٹن۔ اس کی اصل ترکی صورت دوگمہ ہے۔

توشک۔ جامۂ خواب یا بستر، توشک خانہ یا توشہ خانہ وہ جگہ ہے، جہاں پوشاک اور دیگر متعلقہ سامان رکھا جائے۔

چادر۔ وہ لمبا چوڑا بن سلا پارچہ ہے جو دیہاتی عورتیں ستر کے لیے بدن پر دوسرے کپڑوں کے اوپر لپیٹ لیتی ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں بھی یہ لفظ بعینہ اسی مفہوم میں مستعمل ہے۔

چادر کا دوسرا معنی خیمہ ہے، اس لیے ایران میں ان خانہ بدوش قبائل کو جو کھلے میدانوں میں خیموں میں رہتے ہیں، چادر نشین کہتے ہیں۔

(۷) ترک ہمیشہ سے اپنی شجاعت اور بسالت کے لیے مشہور رہے ہیں، اور انھوں نے اپنے قومی جوہر بیشتر حرب و ضرب کے میدان میں دکھائے ہیں، اس لیے اُن کے اثر سے ہندوستان کی زبانوں میں جو ترکی الفاظ آئے ہیں، اُن میں سے بہت سے الفاظ معرکہ آرائی اور عسکری



زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً:۔

یلغار۔ جس کی اصلی صحیح صورت ایلغار ہے، کسی سوار فوج کا کمال سرعت سے کوچ کر کے دشمن پر حملہ یا چڑھائی کرنا۔

یُورش۔ دشمن پر دوڑ کر حملہ کرنا یا چڑھائی کرنا، دھاوا بولنا۔

چپقلش۔ تلوار کی لڑائی یا جھڑپ۔

کوچ۔ فوج کا ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرنا، مارچ کرنا۔

ہراوُل۔ مقدمۃ الجیش یا وہ نقیب جو کسی سواری کے آگے پیادہ چلے۔

قراوُل۔ سنتری یا سرحدی محافظ۔

قراوُلی۔ وہ لڑائی جو سرحدی فوجی چوکیوں کے درمیان ہو۔

کُمک یا کومک۔ امداد، خصوصاً امدادی فوج کا دستہ۔

چاوُش۔ نقیب یا سارجنٹ (عربوں نے اس لفظ کو لیکر شاویش بنالیا ہے)

بَیرق۔ علم، جھنڈا۔ بیرقدار (یعنی علمبردار) اسی بیرق سے ماخوذ ہے۔

سَنجق۔ علم، جھنڈا۔

پرچم۔ پھندنا جو نیزے کے سرے پر باندھتے ہیں۔

یَراق۔ سازوسامان، اسلحہ

قمچی۔ چمڑے کا کوڑا یا چابک (عربوں نے اس لفظ کو لیکر قمشہ بنالیا ہے)

چاقو۔

(۸) مسلمان اقوام میں ترکوں نے سب سے پہلے آتشیں اسلحہ اور توپخانہ کی اہمیت اور افادیت کو سمجھا، اور ان کے استعمال سے فائدہ اٹھایا۔ تاریخ اسلام میں اس کا سب سے

پہلا مظاہرہ مرج دابق (شام) کی جنگ میں ہوا (۲۴ اگست ۱۵۱۶ء) جس میں سلطان سلیم عثمانی کی فوج نے توپ و تفنگ کے استعمال سے مصر کے مملوکوں پر فتح پائی۔ حالانکہ مملوک ذاتی بہادری اور شجاعت میں کسی سے کم نہ تھے۔ اس کے دس سال بعد یعنی ۱۵۲۶ء میں توپخانہ نے اسی قسم کا کرشمہ پانی پت کے میدان میں دکھلایا، جہاں بابر بادشاہ کے ساتھ صرف بارہ ہزار فوج خاصہ تھی، لیکن ابراہیم لودھی کی ایک لاکھ سپاہ اس ترک کے توپخانہ کی بے پناہ گولہ باری کے آگے نہ ٹھہر سکی، اس لیے یہ امر تعجب خیز نہیں کہ اردو زبان میں توپخانہ اور آتشیں اسلحہ کے متعلق اکثر الفاظ ترکی ہیں، مثلاً

توپ۔ جسے عثمانی ترک طوپ لکھتے ہیں یا لکھتے تھے، توپ کا اصلی معنی گولہ ہے۔

توپچی۔ توپ چلانے والا۔

توپخانہ۔ دراصل وہ کارخانہ ہے جہاں توپ تیار ہوتی ہے۔

تفنگ۔ وہ آتشیں ہتھیار ہے جسے کندھے پر رکھ کر چلایا جائے۔

تفنگچی۔ فوجی جو تفنگ چلائے، اس کا فارسی ترجمہ تفنگ انداز ہے۔

(۹) ترکی اور تاتاری حکمرانوں اور امیروں کے جو نام تاریخی اور ادبی کتابوں میں پائے جاتے ہیں، وہ مہمل نہیں بلکہ بامعنی ہیں، مثلاً

آرسلان۔ بمعنی شیر ( Lion )

قزل ارسلان۔ شیر سرخ

الپ تگین۔ بہادر سورما

اُلغ بیگ۔ بیگ بزرگ، امیر کبیر

اوکتائو۔ خوش نصیب، فیروز بخت۔



اللہ ویردی خاں۔ اللہ ویردی کا معنی ہے خدا پرست۔

بابُر۔ بمعنی شیر ( Tiger )

بُغرا خاں۔ بُغرا کا معنی نر اونٹ ہے۔

باتو خاں۔ باتو کا معنی طاقتور ہے۔

بغا یا بوغا۔ بمعنی بیل، طاقتور جانوروں کے نام سطوت و صولت کے اظہار کیلئے اختیار کیے جاتے تھے۔ ملاحظہ ہو انگریزوں کا قومی لقب John Bull

بَیرم خاں = عید ے خاں۔ بیرم کا معنی عید ہے۔

تیمور۔ تمُر یا تیمور کا معنی لوہا ہے (ملاحظہ ہو روسی نام Stalin جس کا لفظی معنی ہے سٹیل یعنی فولاد کا بنا ہوا مرد آہنین)

تغری بردی = تنگری بردہ = خدا بندہ = عبداللہ

تولوی۔ بمعنی آئینہ

چقماق۔ ایک مشہور پتھر ہے جو اپنی سختی اور مضبوطی کے لیے مشہور ہے۔ عرب مورخین اس نام کو جقمق لکھتے ہیں۔

سُنقر یا سُنغر۔ باز

آق سُنقر۔ باز سپید۔

طُغرل بیگ۔ طغرل کا معنی شاہباز ہے۔

علی قلی = غلام علی

قراخاں = کالے خاں، قرہ یا قرا کا معنی سیاہ ہے۔

قلیج خاں، قلیج کا معنی تلوار ہے۔

منگو خاں، منگو کا معنی جاوید ہے۔

یلدرم، برق، بجلی کی کڑاک، رعد، سلطان بایزید کا لقب تھا۔

(۱۰) مندرجۂ بالا کلمات کے علاوہ ذیل کے الفاظ بھی ترکی ہیں:-

ایلچی، اتالیق، استرا، اَلَم غَلَم، بی بی، بقچہ یا بغچہ (گٹھری یا بنڈل)، باورچی، تمغا،
تومان (= دس ہزار۔ تمندار اسی سے ماخوذ ہے)، توزک، جرگہ، جوق جوق، چیچک (پھول)
خربوزہ، خواجہ، داروغہ، سراغ، سوغات، شلغم، قاز، قالین، قابو، قدغن، قینچی،
قُرساق، قَلتبان (بھڑوا)، کاکُل، کوچک، کلابتون، کوسہ، کوتک، گولہ (غلام)
مُچلکا، نوکر، یَغما (لوٹ)، یرغمال۔

**بعض ترکی کلمات کی تشریح**

مندرجۂ بالا کلمات میں سے بعض الفاظ تشریح طلب ہیں، چونکہ اس تشریح کی سیاق کلام میں گنجائش نہ تھی، اس لیے ان الفاظ پر ذیل کے صفحات میں الگ نوٹ لکھے جاتے ہیں، جو امید ہے ناظرین کی دلچسپی کا موجب ہوں گے۔

اردو، اردو ہندوستان اور پاکستان کی وہ لنگوا فرنیکا (Lingua Franca) یعنی عام فہم اور کثیر الاشاعت زبان ہے جو دونوں ملکوں میں پشاور سے لیکر چاٹگام تک اور سری نگر سے مدراس اور میسور تک اگر ہر جگہ بولی نہیں جاتی تو کم از کم سمجھی ضرور جاتی ہے، "اردو" ترکی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی لشکر یا لشکرگاہ (کیمپ) ہے، اس نام سے اسکی ابتدا کی پوری وضاحت ہوتی ہے یعنی اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ اس زبان کی ابتدا کہاں اور کن حالات میں ہوئی اور کن لوگوں نے اس کی تشکیل و ترقی میں حصہ لیا، خود زبان کے علاوہ تاریخی واقعات بتاتے ہیں کہ زبان نووارد مسلمانوں اور مقامی ہندو باشندوں کے باہمی میل ملاپ کا نتیجہ ہے، اور اس لحاظ سے انڈو مسلم کلچر کی ایک پائدار لسانی اور ثقافتی یادگار ہے، بقول



ادیب لبیب پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی سرگباشی "اردو کیا ہے؟ دو مختلف معاشرتوں، دو مختلف مذہبوں، دو مختلف کلچروں کے شیر و شکر ہونے اور ارتباط کی یادگار۔ وہ ہے عرب کے مذہب اور ایران کی کلچر کا دنیا کی سب سے قدیم کلچر یعنی آرین تہذیب سے تصادم نہیں، بلکہ اختلاط، یہ سب کچھ اپنے آپ ہوا، بالطبع ہوا۔"[1]

مختلف قوموں کا باہمی اختلاط سب سے پہلے مسلمان حکمرانوں کے "اردو" یعنی کیمپ میں ہوا، لہٰذا ان کے میل جول سے جو نئی زبان پیدا ہوئی، وہ "زبانِ اہلِ اردو" یا "زبانِ اردو" کہلائی اور پھر محض "اردو" کے نام سے موسوم و مشہور ہوئی۔

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان کے اسلامی کیمپ کو جہاں اس زبان کی بنیاد پڑی، "اردو" کیوں کہتے تھے یا بالفاظ دیگر اس کے لیے ایک ترکی لفظ کیوں استعمال کرتے تھے، اس کی توجیہ یہ ہے کہ نووارد مسلمان حکمرانوں اور ان کے ہمراہیوں میں اکثر لوگ ترک تھے، جو وسطی ایشیا کے ترکی علاقوں سے آئے تھے اور جن کی مادری زبان ترکی تھی۔ ہندوستان میں سطوتِ اسلام جن حکمران خاندانوں کے قوتِ بازو سے قائم ہوئی، اُن میں سے اکثر ترکی نسل سے تھے، سلطان محمود غزنوی جس نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے، اور بالآخر پنجاب کو مستقل طور پر اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، ترک تھا، اس کے بعد محمد غوری جس نے دہلی کے راجہ کو شکست دے کر شمالی ہند میں اسلامی سلطنت کے قیام کے لیے راستہ کھول دیا، اگرچہ غور کا افغان تھا، لیکن اس کا سپہ سالار اور نائب قطب الدین ایبک جس نے اس کی وفات کے بعد ہندوستان میں ایک مستقل سلطنت کی بنیاد ڈالی، ترک تھا، اور سادات، لودھی اور سوری خاندانوں کے علاوہ باقی تمام خاندان جو دہلی کے تخت پر بیٹھے، ترک تھے، ان حالات میں اگر ہندوستان

---

[1] منقول از "خمسۂ کیفی" ص ۱۸، مطبوعہ دہلی ۱۹۳۹ء

کا اسلامی لشکرگاہ 'اردو' کہلایا تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں بلکہ ایک طبعی امر ہے۔

لفظ اردو کی بحث کے سلسلہ میں یہ دلچسپ بات قابل ذکر ہے کہ یہ لفظ یورپ کی متعدد زبانوں مثلاً انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور پولش میں بھی Horde کی صورت میں دخیل ہو چکا ہے، اور لشکر یا فوج کے معنی میں بکثرت مستعمل ہے۔ یہ لفظ مغربی ملکوں اور مغربی زبانوں میں کیسے پہنچا؟ اس کی تشریح یہ ہے کہ تاتاریوں نے تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں صرف چین اور اسلامی ملکوں ہی کو تاخت و تاراج نہیں کیا تھا بلکہ ان کی ایک شاخ نے چنگیز خاں کے پوتے باتو خاں کی سرکردگی میں ۱۲۳۶ء میں یورپ پر چڑھائی کی تھی، اور مغرب کی طرف بڑھتے بڑھتے پولینڈ اور مشرقی جرمنی کی سرحدوں تک جا پہنچے تھے۔ انھوں نے بلادروس میں دریائے والگا کے علاقہ میں، جسے اسلامی مورخوں نے 'دشت قبچاق' کہا ہے، جو مملکت قائم کی وہ اڑھائی سو سال تک قائم رہی، ان وجوہ سے یورپ کے لوگ لفظ 'اردو' سے آشنا ہوئے جو تاتاری لشکر کے لیے استعمال ہوتا تھا جس میں بہت سے ترک قبیلے بھی شامل تھے، اوکسفرڈ انگلش ڈکشنری (کلاں) کے مؤلف لکھتے ہیں کہ Horde کی ابتدا میں جو H پایا جاتا ہے اسے پولینڈ والوں نے بڑھایا تھا۔[1]

[1] تاتاریوں کی جس شاخ نے روس کے ملک میں اپنی حکومت قائم کی تھی، وہ تاریخ میں "الوس اردو" کے نام سے مشہور ہے، روسی اسے Zolotaya Orda اور انگریز Golden horde کہتے ہیں۔ اسکے متعلق یہ بات قابل ذکر ہے کہ تمام تاتاریوں میں سب سے پہلے یہی لوگ تھے جنھوں نے اپنے حکمران برکہ خاں (۱۲۵۵ء تا ۱۲۶۶ء) کی سرکردگی میں قبول اسلام میں سبقت کی تھی، باتو خاں کا خاندان کچھ مدت کے بعد زوال پذیر ہو گیا لیکن دشت قبچاق میں مسلمان تاتاریوں کی آبادی بدستور باقی رہی، اسے عہد حاضر میں روسی حکمرانوں نے تاتار سوویٹ ری پبلک (Tatar Soviet Republic) کے نام سے ایک الگ ریاست کی صورت دیدی ہے جس کا صدر مقام قازان کا مشہور تاریخی شہر ہے۔



آغا (آقا)۔ آغا تاتاری (مغولی) زبان کا لفظ ہے، جس کے لغوی معنے بڑے بھائی کے ہیں، ترکی زبان میں بھی اس کے یہی معنے ہیں۔

چھوٹے بھائی کو مغولی میں اینی کہتے ہیں، مغول کی تواریخ میں 'آغا و اینی' کے الفاظ بکثرت استعمال ہوئے ہیں، چنانچہ تاریخ وصاف میں جس کا سنہ تصنیف ۷۰۰ھ یعنی ۱۳۰۰ء ہے، کیخاتو خاں کی ہلاکت کے ذکر میں اس طرح آیا ہے:

"چوں کیخاتو از ترتیب ملک داری اعراض نمود و یاسا چنگیز خانی دگرگوں کرد، باتفاق آغا و اینی و خواتین و امراء او را بر داشتیم"۔

جامع التواریخ کے مؤلف رشید الدین فضل اللہ نے بھی آغا و اینی کی ایسی تعبیر کی ہے جس سے ان الفاظ کا اطلاق تمام بھائیوں اور ان کی اولاد پر ہوتا ہے۔

ایلخانی اور تیموری دور کی تاریخی کتابوں میں "آغایان و خواتین" اور "آغایان و شاہزادگان" کے الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔

آغا کا لفظ از راہ احترام تیموری اور صفوی دور میں شاہی خاندان کی خواتین اور شاہزادیوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، مثلاً گوہر شاد آغا، شاد ملک آغا وغیرہ۔

تاتاریوں کے دستور کے مطابق بڑا بھائی دوسرے تمام بھائیوں اور ان کی اولاد پر برتری رکھتا تھا، اور ان کو اپنے ضبط میں رکھنے کا مجاز تھا، اس لیے آغا کے معنے رفتہ رفتہ خاندان کے بزرگ اور رئیس اعلیٰ اور پھر مطلق بزرگ و برتر اور مالک کے ہو گئے، چنانچہ ایک مدت سے ایران اور ہندوستان میں آغا کا لفظ کلمہ تعظیمی کے طور پر مستعمل ہے۔

ایران میں آغا کو بالعموم آقا لکھتے ہیں اور اس کی جمع آقایان بناتے ہیں، لیکن جمع کا یہ صیغہ فارسی قواعد کے مطابق بنایا گیا ہے۔

عثمانی ترکوں کے ہاں بھی آغا کا لفظ تعظیم و تکریم کے لیے آتا ہے اور کئی عہدہ داروں کے القاب میں استعمال ہوتا ہے۔

فارسی زبان کے اکثر لغت نگاروں نے آغا کے مذکورہ بالا دونوں معنی یعنی (۱) برادر بزرگ اور (۲) مالک اور بزرگ مطلق درج کیے ہیں، لیکن اس کے ثانوی معنے کو غالباً شہرت عام کی بنا پر بالعموم مقدم رکھا ہے۔ مگر اس ترتیب سے لفظ کے معنی اور اس کے مفہوم کے ارتقاء کی حقیقت واضح نہیں ہوتی۔

آغا خاں۔ آج کل اسمٰعیلی شیعوں کی نزاری شاخ کے اماموں کا امتیازی لقب ہے۔ یہ لقب قاچاریوں کے عہد میں دربار ایران کی طرف سے حسن علی شاہ کو دیا گیا تھا، جو موجودہ آغا خاں کے مورث اعلیٰ تھے۔ اب یہ لقب ان کے خاندان میں موروثی بن گیا ہے (اس سلسلہ میں یہ امر ذہن نشین رہے کہ زند اور افشار کی طرح قاچار خاندان کے حکمراں بھی نسلاً ترک تھے)۔

آغا اور خان دونوں ترکی بلکہ تاتاری زبان کے لفظ ہیں، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے عالم اسلام میں یہ الفاظ تاتاریوں کی آمد سے پہلے استعمال میں نہیں آئے، میرے لیے اور غالباً ناظرین کرام کے لیے بھی یہ امر بعید تعجب انگیز اور قابل غور ہے کہ فی زمانہ ایک اسلامی فرقے کے مذہبی پیشوا کے لیے اس قوم کی زبان کے الفاظ بطور لقب کے احتراماً استعمال ہوں جس نے کسی زمانہ میں اسلامی دنیا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی، اور خلافت بغداد کا چراغ گل کر دیا تھا لیکن اس عجوبہ کی تشریح ہمیں ان تاریخی واقعات اور انقلابات میں ملے گی جن کی طرف میں نے صفحات بالا میں اشارہ کیا ہے، تاتاریوں کو ایک زمانہ میں قضا و قدر کی طرف سے جو عزت و حکومت ارزانی ہوئی تھی، اس کی بدولت ان کی زبان کے الفاظ و القاب کو وہ وقعت اور وجاہت اور رفعت نصیب ہوئی کہ مہذب اور متمدن قوموں کے لوگ آج بھی ان کے استعمال کو اپنے لیے مایۂ افتخار و امتیاز



سمجھتے ہیں، تُعِزُّ مَن تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَآءُ بِیَدِكَ الْخَیْرُ۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ انگریزی عہد میں حکمرانوں کی طرف سے بعض ہندوستانیوں کو ان کی خدمات کے صلہ میں خان بہادر کا خطاب ملا کرتا تھا، اس ضمن میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ بہادر کا لفظ بھی خالص تاتاری ہے۔

آق۔ آق ایک ترکی لفظ ہے جس کا معنی سفید ہے اور جو ذیل کے مرکب کلمات کا جزء ہے۔

آق صو، لفظی معنی: آب سفید۔ ترکستان کے متعدد دریاؤں کا نام ہے۔

آق سرائے، ترکی کا ایک شہر ہے۔

آق سُنقُر، زنگی خاندان کا بانی۔ لفظی معنی: باز سفید۔

آق قویونلی، سفید بھیڑ والے۔ ترکمانوں کا ایک اہم تاریخی قبیلہ تھا، جن کے علم پر سفید بھیڑ کی تصویر بطور علامت ہوا کرتی تھی۔

آتا۔ ترکی ہے، بمعنی باپ

پلاٹس[1] نے اپنی اردو انگریزی ڈکشنری میں اسے فارسی لکھا ہے، جو غلط ہے۔

آتا کا لفظ کئی مرکب کلمات میں احتراماً استعمال ہوا ہے، مثلاً:۔

اتابیگ۔ سلجوقی سلاطین کے ہاں دستور تھا کہ وہ ہر شہزادہ کی تعلیم و تربیت کے لیے کسی ذی رتبہ امیر کبیر کو مقرر کر دیتے تھے، شہزادے اسے از راہ تعظیم آتا بیگ کہتے تھے، بیگ کا لفظ بھی ترکی ہے، جس کا معنی امیر کبیر ہے، یہی اتا بیگ جو ابتدا میں شہزادوں کے اتالیق اور سربراہ تھے، رفتہ رفتہ سلاجقہ کی سلطنت پر متسلط ہو گئے، عرب مصنفوں نے اتابیگ کو اتابک لکھا ہے اور اس کی جمع اتابکہ بنالی ہے۔

---

[1] Urdu Classical Hindi and English Dictionary by J.T. Platts. Oxford, 1930

اتاترک ۔ یہ وہ لقب ہے جو ترکوں نے مصطفیٰ کمال پاشا (متوفی ۱۹۳۸ء) کو اس کے شاندار

فوجی کارناموں اور اعلیٰ قومی خدمات کے اعتراف میں دیا تھا۔

اتالیق ۔ کسی خورد سال لڑکے کا معلم و مؤدب اور نگران کار ۔

الپ ۔ الگ ایک ترکی لفظ ہے جس کا معنی بہادر اور دلاور ہے اور جو ترکی ناموں میں

اکثر ملتا ہے ، مثلاً

الپ تگین ، وہ ترک سردار جس نے سامانیوں سے برگشتہ ہو کر غزنی میں اپنی الگ بساط حکومت

بچھائی اور بعد ازاں سبکتگین اور اس کا بیٹا سلطان محمود اس کے جانشین ہوئے ۔

الپ ارسلان ، سلجوقی خاندان کا نامور سلطان جس نے ملازگرد کی جنگ میں قیصر دیوجانس

پر فتح عظیم پائی تھی ،

الپ خاں ، جسے بعض کم سواد لوگ غلطی سے الف خاں لکھتے اور پڑھتے ہیں ،

ایل ، ایک ترکی کلمہ ہے جس کا معنی قوم یا قبیلہ ہے ۔ یہ لفظ ذیل کے مرکبات میں پایا جاتا ہے :

ایل بگی ، اپنے قبیلہ کا بیگ یعنی امیر یا سردار

ایلچی ، سفیر جو اپنے قبیلہ یا ملک کی نمائندگی کرتا ہے ۔

ایلخان ، اپنے قبیلہ کا خان یا حاکم

تاتاریوں کے خاقان یعنی خان اعظم کے مقابلے میں ہلاگو خاں کو منگولی سلطنت کے صرف ایک

حصے یا صوبے کا حاکم تھا ، اس لیے اس کا لقب ایلخان ٹھہرا ، اور اس کا خاندان ایلخانی کہلایا

جو اس کے بعد ایران پر حکمراں رہا ،

جدید فارسی میں "ایلخانی" کا لفظ سرداری کے معنی میں مستعمل ہے ،

ایران میں ایل کی جمع ایلات بنالی گئی ہے ، اور ایلات (یا ایلیات) سے مراد ترکی نسل کے



وہ قبائل ہیں جو آجکل ایران کے میدانوں اور صحراؤں میں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں ،

اقصرائی ۔ اقصرائی علم طب کی ایک کتاب ہے ، جو عربی مدارس میں داخلِ نصاب رہ چکی

ہے ، اقصرائی دراصل اس کتاب کے مصنف کا نام ہے ۔

علامہ قرشی نے شیخ الرئیس کے قانون کی تلخیص "موجز القانون" کے عنوان سے کی تھی ، اس

پر جمال الدین محمد الاقصرائی نے ایک شرح لکھی ، جو اقصرائی کے نام سے مشہور ہوئی ۔

لفظ اقصرائی کی ہیئت کو دیکھکر ناظرین اسے غالباً عربی تصور کریں گے ، لیکن اسکی

تہ میں ایک ترکی لفظ آق (بمعنی سفید) پوشیدہ ہے ۔

اقصرائی دراصل آقسرائی تھا ، اقصرائی اسی کا معرب ہے ،

آقسرائی منسوب ہے آق سرائے کی طرف جو ترکی کا ایک شہر ہے ۔

آق سرائے میں آق ایک ترکی کلمہ ہے ، جس کا معنی سفید ہے ، لہذا آق سرائے

کا لفظی معنی ہوا "شہر سفید" یا "دار البیضاء" ۔

اَلّم غَلّم ۔ بے معنی اور مہمل باتیں جو سمجھ میں نہ آئیں ، جن کا کوئی سر پیر نہ ہو ۔ "کسی

چیز کو الم غلم کرنا" یعنی فریب دہی یا حیلہ بہانہ سے کسی چیز کو اڑا لینا ، ہیر پھیر کرنا ۔

یہ کلمہ دراصل ترکی ہے جس کو ترک "الم قلم" لکھتے ہیں ، اور اسی معنی میں استعمال کرتے

ہیں جس مفہوم میں یہ محاورہ اردو میں مستعمل ہے ، (دیکھو ریڈ ہاؤس کی ترکی انگریزی لغات

مطبوعہ قسطنطنیہ ۱۸۹۰ء ، ص ۱۶۸)

امیر احمد مینائی لکھنوی اس محاورہ کے اصل کے بارے میں خاموش ہیں ، اور عدم واقفیت

کی صورت میں ان کی خاموشی ، ان کی احتیاط پسندی اور دانشمندی کی دلیل ہے لیکن پلاٹس

نے (اور ان کے تتبع میں جامع اللغات کے مؤلف خواجہ عبد المجید لاہوری نے بھی) جو

لغت نویسی کے میدان کے حاطب اللیل ہیں )، اس محاورہ کو فارسی اور ہندی بتایا ہے جس سے ان کی مراد غالباً یہ ہے کہ یہ کلمہ دراصل فارسی ہے اور پھر ہندی میں مستعمل ہے، اور یہ دونوں باتیں محلِ نظر ہیں، کیونکہ اس کے فارسی الاصل ہونے کی کوئی سند نہیں، دوسرے اس کا رواج بیشتر اردو داں طبقہ میں ہے لیکن پلاٹس صاحب کی زبان سے اردو کا نام بہت کم سننے میں آتا ہے۔

( باقی )

---

# گجرات کی تمدنی تاریخ

( مسلمان حکمرانوں کے عہد میں )

گجرات کا اسلامی دور بہت شاندار رہا ہے، اس دور میں گجرات نے علمی، تمدنی، صنعتی، تجارتی، تعمیری ہر حیثیت سے بڑی ترقی کی، اور وہ شاہان گجرات کے ذوق تعمیر و نفاست پسندی سے رشک ارم بن گیا، جس کے آثار آج بھی وہاں پائے جاتے ہیں۔ اس پر اردو میں کوئی کتاب موجود نہیں تھی مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی مرحوم نے یہ کتاب لکھکر اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے، جس میں نہایت کاوش اور تلاش و جستجو سے قدیم فارسی ماخذ، اور دوسری کتابوں سے گجرات کی تمدنی تاریخ اور شاہان گجرات کے آثار و مشاہدے متعلق ہر قسم کے معلومات فراہم کیے گئے ہیں۔

ضخامت ۳۳۹ صفحے۔ قیمت ۶

مولانا سید ابو ظفر صاحب مرحوم کی دوسری اہم کتاب **تاریخ سندھ** کا دوسرا اڈیشن بھی تیار ہو گیا ہے، ضخامت ۴۱۶ صفحے، قیمت ۵۰

منیجر



# شوقی اور اُن کی شاعری

( سنہ ۱۸۶۹ء — سنہ ۱۹۳۲ء )

از جناب مولوی مقتدی حسن صاحب اعظمی فاضل الازہر یونیورسٹی قاہرہ

( ۴ )

**دربار شاہی میں**

شوقی سنہ ۱۸۹۲ء میں جب مصر واپس آئے تو خدیوی توفیق کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کی جگہ عباس دوم تخت نشین ہوئے تھے، عباس نے شوقی کو دربار میں ترجمہ کا شعبہ سونپ دیا، دربار میں شوقی کو بہت زیادہ مقبولیت اور عروج حاصل ہوا، اور سنہ ۱۸۹۲ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک کی طویل مدت میں شوقی کی شاعری کا محور عباس اور اس کے کارنامے تھے محل شاہی ہی میں باہر کی دنیا سے شوقی یکسر بے تعلق تھے۔

اس عہدہ پر شوقی نے بیس ۲۰ سال گذارے جو ان کی زندگی کا بہترین دور شمار کیا جاتا ہے، اسی مدت میں انھوں نے ایک مالدار عورت سے شادی کی جو بہترین رفیقۂ حیات ثابت ہوئی، اس کے بطن سے دو لڑکے علی اور حسین اور ایک لڑکی امینہ پیدا ہوئی،

دربار شاہی سے شوقی کا جب تک تعلق رہا وہ فکری اعتبار سے مفید اور شاہی پالیسی سے ہم آہنگ تھے، بڑے سے بڑے واقعات میں بھی وہ حکومت مصر کے خلاف عوام کے جذبات کی ترجمانی نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ جب دنشوای کا واقعہ پیش آیا تو شوقی ایک سال تک بالکل خاموش رہے، اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ مصر کے ایک ضلع "شبین الکوم" کے "دنشوای" نامی

گاؤں میں انگریز فوجیوں کی ایک جماعت ۱۳ جون ۱۹۰۶ء کو فاختہ کا شکار کرنے کی غرض سے گئی، شکار میں ان کی گولی سے ایک مصری عورت زخمی ہوگئی اور کسانوں کے کھلیان میں آگ لگ گئی، اس واقعہ سے گاؤں کے کسان غصہ میں بھر گئے اور گھروں سے نکل پڑے، انگریز فوجیوں نے ان پر بڑی زیادتی شروع کی اور ایک بڈھے آدمی کو جان سے مار ڈالا، گاؤں والوں نے ان پر پتھر برسانا شروع کر دیے، جس سے ایک فوجی افسر کے سر میں چوٹ آئی اور سب بھاگ کھڑے ہوئے، زخمی فوجی تقریباً آٹھ میل تک بھاگنے کے بعد تیز دھوپ کی تاب نہ لاکر گر پڑا اور وہیں مرگیا۔ اس واقعہ سے انگریزوں میں آگ لگ گئی اور انھوں نے مخصوص فوجی عدالت میں گاؤں والوں پر مقدمہ چلا کر اکتیس آدمیوں کو ملزم قرار دیا جن میں سے چار کو سولی دی گئی اور باقی لوگوں کو مارنے پیٹنے کے بعد قید کر دیا گیا۔[۵]

اس واقعہ پر شوقی نے فوراً کچھ نہیں کہا، عوام کو امید تھی کہ یہ نامور شاعر اس المناک حادثہ کے بارے میں ان کے جذبات کی ضرور ترجمانی کرے گا، لیکن قصر کی پالیسی انگریزوں کے حق میں تھی، اور خدیوی عباس انگریزوں کے قبضہ سے خوش اور مطمئن تھا، اسلیے انگریزوں کے خوف اور عباس کی رضاجوئی میں شوقی بھی خاموش رہے۔ ایک سال کے بعد جب مقررہ انگریز حاکم مصر سے چلا گیا تو شوقی نے "ذکری دنشوای" کے عنوان سے جو ۲۴ اشعار کا ایک قصیدہ لکھا[۶]، اس کے چند اشعار یہ ہیں:-

یا دنشوای علی رباك سلام — ذهبت بأنس ربوعك الأيام

عشرون بيتاً أقفرت وانتابها — بعد البشاشة وحشة وظلام

يا ليت شعري في البروج حمائم — أم في البروج منية وحمام

---

۵ عبدالرحمن الرافعی: مصطفی کامل ص ۱۵۰، ۶ عمر الدسوقی: فی الادب الحدیث ج ۲ ص ۹۴



نيرون لو أدركت عهد كرومر — لعرفت كيف تنفذ الأحكام

دنشوای! تیری سرزمین سلامت رہے، تیرا سکون زمانہ کے ہاتھوں غارت ہوگیا۔

بیس گھر سنسان ہوگئے، اور خوشی کے بعد ان میں وحشت وتاریکی چھاگئی۔

معلوم نہیں برج میں کبوتر رہتے ہیں یا وہاں پر موت کا بسیرا ہے؟۔

نیرون! اگر تم کرومر کے عہد میں ہوتے تو سمجھ میں آتا کہ احکام کا نفاذ کیسے کیا جاتا ہے۔

فرانسیسی شعراء کے کلام کے مطالعہ سے ان میں ایک نیا رجحان پیدا ہوچکا تھا، اسکے زیر اثر انھوں نے "کبار الحوادث فی وادی النیل" کے عنوان سے ایک طویل قصیدہ لکھا جس میں فراعنہ کے دور سے لیکر محمد علی کے دور تک کی مصری تاریخ کو خوبصورتی کے ساتھ سمویا گیا ہے، اس قصیدہ کو شوقی نے ۱۸۹۴ء میں مستشرقین کی کانفرنس میں سنایا، اس کے بعد فراعنہ اور قدیم مصری آثار کے بارے میں انھوں نے متعدد قصیدے لکھے۔

**جلاوطنی**

شوقی اور ان کی شاعری اب تک قصر شاہی میں محصور تھی لیکن پھر ایسے واقعات پیش آئے کہ شوقی کو جلاوطنی کی زندگی بسر کرنی پڑی، اور اب شوقی شاہی محل سے باہر کی دنیا میں آگئے اور ان کی شاعری ایک نئے مرحلہ میں داخل ہوئی۔

۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگ عظیم کا اعلان ہوا تو مصری بادشاہ عباس ترکی میں تھا، انگریزوں نے اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاکر مصر پر اپنے قبضہ اور تسلط کا اعلان کر دیا اور عباس کی جگہ حسین کامل کو بادشاہ مقرر کیا، عباس کے حاشیہ نشینوں اور درباریوں کا تعلق بھی قصر شاہی سے ختم کر دیا گیا، شوقی، عباس کے قریب ترین لوگوں میں تھے، اس لیے ان کی سخت نگرانی ہونے لگی، ان واقعات سے شوقی بہت متاثر ہوئے، عباس کے مقابلہ میں وہ نئے بادشاہ حسین سے مطمئن نہیں تھے، لیکن بدلتے ہوئے حالات کو روکنا بھی مشکل تھا، اس موقع پر

شوقی نے ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع تھا:

أأخون اسماعیل فی ابنائہ ولقد وُلدتُ بباب اسماعیلا

(میں اسمٰعیل کے ساتھ انکی اولاد کے سلسلہ میں خیانت نہیں کر سکتا جبکہ میں ان ہی کے دروازہ پر پیدا ہوا ہوں)

اس قصیدہ میں شوقی نے اپنی بےچینی کا اظہار کیا ہے، ایک مصرع میں کہتے ہیں: ان الروایۃ لم تتم فصولا (ڈرامہ کے تمام سین ابھی پورے نہیں ہوئے ہیں) یعنی انگریز علوی خاندان کو زک دینے کے لیے حالات کے منتظر ہیں، شوقی کی شعلہ بیانی سے انگریزوں کو اندیشہ لاحق ہوا اگر انھیں مصر میں چھوڑ دیا گیا تو یہ اپنے کلام سے ہیجان پیدا کر دیں گے اور پھر عوام کی بغاوت کا روکنا بہت مشکل ہو جائے گا، چنانچہ شوقی جلاوطن کر دیا گیا، اور انھوں نے برشلونہ کے ایک گاؤں میں سکونت اختیار کی، یہ مقام سمندر کی سطح سے بلند ہونے کی وجہ سے پُربہار تھا، شوقی اس منظر سے لطف اندوز ہوتے تھے، اور بندرگاہ پر آنے جانے والے جہازوں کا نظارہ انکے جذبۂ شاعری کو تیز کرتا تھا، شوقی یہاں آکر آزادی کی ایسی دنیا میں پہنچ گئے تھے جس میں قصر شاہی کی قیود اور فکری پابندیوں کا نام و نشان بھی نہیں تھا،

شوقی کی زندگی کا یہ دور ان کے رنج و محن کا سبب بنا، ان کی خوشگوار زندگی میں بڑی تلخیاں پیدا ہو گئیں، مالی مشکلات، وطن سے دوری اور بادشاہ کی معزولی ان کے لیے تلخ گھونٹ کی حیثیت رکھتے تھے، ان کی شاعری کو اس تلخی کی ضرورت تھی، تاکہ شوقی زندگی کے دونوں رخوں سے واقف ہوں، جس طرح قصر میں ناز و نعمت کا ماحول دیکھا، اسی طرح جلاوطنی میں حرماں نصیبی اور آلام روزگار سے آشنا ہوں اور انھیں عوام کے درد اور ان کے مصائب کا اندازہ ہو سکے۔

۱۹۱۸ء میں جب صلح کا اعلان ہوا تو شوقی کو اسپین کے شہروں میں جانے کی اجازت ملی اور انھوں نے قرطبہ، اشبیلہ اور غرناطہ دیکھے، ان میں عربوں کے آثار آج بھی زبان حال سے



ان کی عظمت کی داستان سنا رہے تھے، شوقی ان آثار سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور اپنا مشہور سینیہ قصیدہ لکھا جس میں وطن کے اشتیاق، مصر کے مشہور مقامات و آثار اور ان کے دامن میں سمٹی ہوئی تاریخ کے ذکر کے بعد اندلس اور وہاں کی حکومتوں کا ذکر کیا ہے، اور اپنے اشعار میں قصر حمرا، کی ایسی حسین عکاسی کی ہے کہ اس کا سراپا آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، عربوں کے اندلس میں داخلہ اور یہاں سے ان کے زوال کے بارے میں کہتے ہیں کہ: آئے ہوئے جو جہاز تخت شاہی کا منظر پیش کرتے تھے، ان ہی جہازوں پر زوال کے بعد مقبروں کا گمان ہوتا ہے

رکبوا البحار نعشا و کانت تحت آبائھم ھی العرش امس

اس قصیدہ میں قرطبہ میں عربوں کی تہذیب و ترقی کے متعلق اچھے تاثرات کو شعر کے قالب میں ڈھالا اور ان سے دوسروں کو متاثر کرنے کی کوشش کی ہے،

اندلسی شعراء میں شوقی کو ابن زیدون سب سے زیادہ پسند ہے، اندلس آنے سے پہلے شوقی کو وجدانی شاعری سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا، ان کو متنبی کی طرح قصیدہ گوئی سے زیادہ مناسبت تھی لیکن اندلس آنے کے بعد انھوں نے ابن زیدون کا مطالعہ اور اپنے نونیہ قصیدہ میں ان کا تتبع کیا، اس قصیدہ میں بھی شوقی نے وطن کا اشتیاق ظاہر کیا ہے، اس قصیدہ میں جو درد و حسرت ہے، اس سے شوقی کی سابقہ شاعری خالی ہے،

جنگ عظیم کے خاتمہ پر شوقی کو فوراً مصر واپس آنے کی اجازت نہیں ملی تھی لیکن اندلس سے باہر جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی، اس لیے انھوں نے اسپین اور پھر جنیوا کا سفر کیا اور وہاں سے بحری جہاز سے مصر آگئے، ان کی آمد پر پورا شہر ان کے استقبال کے لیے ٹوٹ پڑا، جس سے شوقی غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔

**آزاد فضا میں**

شوقی جب وطن واپس ہوئے تو یہاں قومی تحریک پورے شباب پر تھی،

اور یہاں کی ہر چیز انھیں بدلی ہوئی نظر آئی، اور یہیں سے ان کی عوامی زندگی کا آغاز ہوا،[1]

شوقی اب بڑی حد تک "جمہوری" بن چکے تھے، اور پوری عرب قوم کے احساس و شعور کا ساتھ دینا چاہتے تھے، ان کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی اور ہر جگہ ان کا شاندار استقبال کیا جاتا تھا، جیزہ اور اسکندریہ میں ان کا گھر ادباء و شعراء کا مرکز بن چکا تھا، دوسرے بڑے لوگ بھی شوقی سے ملاقات کے لیے ان کے گھر آتے تھے، ۱۹۲۶ء میں ہندوستان کے نامور شاعر ٹیگور بھی شوقی سے ملے تھے۔

۱۹۲۷ء میں جب شوقی نے اپنا دیوان "الشوقیات" دوبارہ شائع کیا تو ان کے اعزاز میں متعدد مجلسیں منعقد ہوئیں جن میں عرب ممالک کے مندوبین نے شرکت کی، اور شوقی کے فن پر عقیدت و قدر دانی کے پھول نچھاور کیے۔

ان تقریبات میں جن ممتاز شخصیتوں نے حصہ لیا اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں:۔ دمشق کے عربک اکاڈمی سے محمد کرد علی، لبنان سے شبلی ملاط، فلسطین سے امین الحسینی، شکیب ارسلان بلجیم سے فنڈ نبرگ، اسی موقع پر شوقی کو عربی شاعری کے "امیر" کا لقب دیا گیا، اور حافظ نے تمام عرب شعراء کی طرف سے شوقی کی بیعت کا اعلان کیا:

امیر القوافی قد اتیت مبایعا          وھذی وفود الشرق قد بایعت معی

اے تاجدار سخنوراں! میں اور میرے ساتھ مشرق کے وفود آپ سے بیعت کے لیے حاضر ہیں۔

شوقی اب عوام سے قریب ضرور آچکے تھے، لیکن یہ قربت افکار و خیالات تک محدود تھی، ان کی زندگی اب بھی شاہانہ تھی، ان کے منشی احمد عبد الوہاب کا بیان ہے کہ یہ پھولوں پر چلتے اور معطر فضا میں سانس لیتے تھے، زندگی میں ہر طرح کی آسودگی و خوشحالی میسر تھی،[2]

---

[1] عمر الدسوقی: فی الادب الحدیث ج ۲ ص ۱۱۹، [2] اثنی عشر عاما فی صحبۃ امیر الشعراء، ص ۸۹



شوقی کا شمار ان شعراء میں نہیں ہے جن کی زندگی کی عکاسی ان کے اشعار سے ہوتی ہو، بلکہ وہ ایسے شعراء میں ہیں، جن کا فن غیروں کے لیے وقف رہتا ہے اور اپنے لیے وہ کچھ نہیں سوچتے۔ خدیوی عباس کے بعد شوقی کے سامنے کوئی ایسی شخصیت نہیں تھی جسے وہ اپنی شاعری کا محور بنا سکیں، اسپین کے پانچ سالہ قیام کے دوران میں وہ اس کی تلاش میں رہے، اسی وجہ سے اس عرصہ میں ان کی شاعری بہت مختصر اور محدود ہو گئی تھی، پھر جب وہاں سے مصر واپس ہوئے اور عوام میں تبدیلی و بیداری نظر آئی تو انھوں نے عوام ہی کو اپنی شاعری کا مرکز بنانے کا فیصلہ اور ان کے ساتھ ملنے جلنے کا سلسلہ شروع کیا اور ان کی زندگی اور شعور کی ترجمانی کی کوشش کی،

مگر اس تبدیلی کے باوجود عمومی لحاظ سے ان کی شاعری میں "ذاتیت" کے بجائے "غیریت" ہی رہی، پہلے وہ عباس کے شاعر تھے اور اب مصری عوام کے شاعر بن گئے، بلکہ عرب دنیا کی ترجمانی کو اپنا موضوع بنایا، مگر ذاتی رنگ اب بھی پیدا نہ ہو سکا اور ان کا فن شاعری دوسروں ہی کا تابع رہا، عباس کے بعد مصری عوام کے روپ میں انھیں دوسرا عباس مل گیا، یہاں شوقی کو اشرفیوں کے بجائے محبت و عقیدت کے جذبات کا صلہ ملتا تھا، جن کی معنوی قیمت سونے چاندی کے سکوں سے زیادہ تھی، اس لیے یہیں سے شوقی کی شاعری میں جذبات کی جھلک نمایاں ہوئی اور وہ عوام کے شعور کی سچی ترجمانی میں کامیاب ہوئے،

شوقی زندگی کے آخری دو سالوں میں مختلف امراض کا شکار رہے، اس زمانہ میں وہ قرآن کریم احادیث نبوی، غزالی اور الجبرتی کی کتابوں کا بکثرت مطالعہ کرتے تھے، مگر طبیعت کی شگفتگی اور ظرافت اس دور میں بھی باقی تھی،

۱۴ اکتوبر ۱۹۳۲ء کی رات میں دو بجے اس عظیم فنکار نے دنیا کو خیرباد کہا اور اس کی سحر آفریں آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی، موت کی خبر سے پوری عرب قوم میں صف ماتم

بچھ گئی، شعرا نے پُرسوز مرثیے اور انشا پردازوں نے مضامین لکھے، جگہ جگہ مجالس تعزیت منعقد ہوئیں اور اخبارات نے رنج و غم کا اظہار کیا، مراثی میں بشارہ خوری کا مرثیہ بہت موثر ہے، جس کا مطلع یہ ہے۔

قف فی ربی الخلد واهتف باسم شاعره ‏ ‏ ‏ ‏ فسدرة المنتهی ادنی منابره

(مقام خلد میں ٹھہر کر اس کے شاعر کا نام لو، سدرۃ المنتہیٰ اس کا ادنیٰ منبر ہے)

شوقی کے دوست خلیل مطران نے اپنے مرثیہ میں شوقی کے فنی کمال اور ان کی موت پر عرب دنیا کے حزن و الم کی بہترین تصویر پیش کی ہے، اس کا ایک شعر ہے۔

یجلو بنوغك كل يوم آيةً ‏ ‏ ‏ ‏ عذراء من آیاته الغراء

(تمھاری مہارت اور کمال کے انوکھے نشانات روزانہ ظاہر ہوتے ہیں۔[1]

**فن شاعری** شوقی نے شاعری کی دنیا میں اس وقت قدم رکھا جب مصر میں عربی شاعری محمود سامی البارودی کے ہاتھوں جمود سے نکل کر آزاد فضا میں آ رہی تھی اور اس کا "شجرۂ طیبہ" برگ و بار پیدا کر رہا تھا، قدرت نے گویا بارودی کو شوقی کا رہنما بنا کر بھیجا تھا، اس کی شاعری شوقی کے لیے نشان راہ ثابت ہوئی،

بارودی نے شعرائے متقدمین کی بیجا قیود اور پر تکلف اسلوب سے شاعری کو آزاد کر کے اس میں ایسی وسعت پیدا کی کہ موجودہ دور کی صحیح ترجمانی کر سکے۔

شوقی نے بارودی کے تتبع میں شاعری کے اسلوب، جمال اور مفہوم میں گہرائی پیدا کی، ان کی شاعری کی تاثیر اور سحر آفریں موسیقی پر آج بھی عرب دنیا سر دھنتی ہے، شوقی کے اس فنی کمال نے ان کی شاعری کو دائمی مقبولیت عطا کی اور ان کے اشعار کا حسن و جمال کبھی مدھم نہیں پڑا۔

[1] شوقی شاعر العصر الحدیث ص ۳۹ [2] عمر الدسوقی: فی الادب الحدیث ج ۲ ص ۳۱۵



موسیقی کے بعد شوقی کی شاعری کا دوسرا اہم عنصر ان کا وسیع تخیل اور کامیاب مصوری ہے، یہ صحیح ہے کہ انھوں نے اکثر اپنا مفہوم قدیم عرب شعرا سے لیا ہے، لیکن اس میں رنگ بھر کر ایک نیا حسن پیدا کر دیا ہے۔

شوقی کی منظر نگاری کا یہ کمال ہے کہ وہ ایک چیز کی تمام جزئیات کو اس خوبی سے پیش کرتے ہیں جس طرح مصور اپنی تصویر کے تمام خط و خال کو واضح کر دیتا ہے، اور وہ زبان حال سے بولنے لگتی ہے[1]۔ مصر میں فراعنہ کی جو یادگاریں ہیں ان میں "قصر انس الوجود" کو بڑی اہمیت حاصل ہے، شوقی نے اپنے قصیدہ میں اس قصر کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے قصیدہ پڑھنے والے کے سامنے کھڑا ہے، لکھتے ہیں:

ايها المنتحی باسوان دارًا ‏ ‏ ‏ ‏ کالثریا ترید ان تنقضا

اخلع النعل واخفض الطرف واخشع ‏ ‏ ‏ ‏ لا تحاول من آية الدهر غضا

قف بتلك القصور فی اليم غرقی ‏ ‏ ‏ ‏ ممسكًا بعضها من الذعر بعضا

كعذاری اخفين فی الماء بضًا ‏ ‏ ‏ ‏ سابحات به وأبدين بضا

شاب من حولها الزمان وشابت ‏ ‏ ‏ ‏ وشباب الفنون مازال غضا

رُبَّ نقشٍ كانما نفض الصانع منه اليدين بالامس نفضا

غزمات من عزمة الجن امضی ‏ ‏ ‏ ‏ ومحاريب كالبروج بنتها

صنعة تدهش العقول وفنٌّ ‏ ‏ ‏ ‏ كان اتقانه علی القوم فرضا

اسوان کے قصر میں جانے والے جو ثریا کی طرح بلند اور مائل بسقوط ہے۔

جوتے نکال دو، نظر پست اور خود کو متواضع رکھو، زمانہ کے معجزہ سے چشم پوشی کی کوشش نہ کرو،

[1] عمر الدسوقی: فی الادب الحدیث ج ۲ ص ۱۶۶

دریا میں ڈوبے ہوئے ان محلات پر نظر ڈالو، محسوس ہوتا ہے کہ ڈر سے بعض بعض کو پکڑے ہوئے ہے،
حسین دوشیزاؤں کے مانند جو تیرتے ہوئے جسم کا کچھ حصہ چھپائے اور کچھ ظاہر کیے ہوئے ہیں۔
زمانے اور خود یہ محلات بوڑھے ہو چکے ہیں لیکن ان کا فن اپنے شباب پر باقی ہے۔
بہت سے نقوش اتنے شفاف و تازہ ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں فنکار نے کل ہی بنایا ہے۔
برج نما محراب کو جنوں سے قوی تر عزم رکھنے والوں نے تعمیر کیا ہے۔
اس فن اور صنعت کاری پر عقل حیران ہے، لوگوں نے پورے خلوص سے اسے استحکام عطا کیا ہے۔)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح شاعر نے اپنے فنی کمال سے قصر کی زندہ تصویر پیش کی ہے،
ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قصر آنکھوں کے سامنے موجود ہے اور معماروں کی فنکاری ان کی عظمت کی داستان
سنا رہی ہے۔ یہ شوقی کے تخیل کا کمال ہے کہ قصر کے تمام پہلوؤں کو اس خوبصورتی سے واضح کیا اور
کلام میں اتنی زبردست تاثیر پیدا کی۔[1]

شوقی کی شاعری کا تیسرا عنصر جذبہ ہے، چونکہ شوقی 'ذاتی' شاعر نہیں ہیں، اس لیے ان کے کلام میں
ان کے ذاتی جذبات کی وہ ترجمانی نہیں ملتی جو دوسرے شعراء کے یہاں ملتی ہے، پھر بھی اس سے انکی
شاعری خالی نہیں ہے، لیکن عباس العقاد کی رائے ہے کہ شوقی کی شاعری میں ایسا کوئی عنصر موجود
نہیں جس کے ذریعہ ہم ان کی شخصیت کو دوسروں سے ممتاز کر سکیں، ان کی شاعری نہ زندگی کا کوئی
پیغام ہے اور نہ فطرت کی ترجمانی، بلکہ اس پر صرف تصنع کا رنگ غالب ہے۔[2]

یہاں تک تو صحیح ہے کہ شوقی کی شخصیت ان کے اشعار میں واضح نہیں ہوتی، لیکن اس سے یہ
نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ ان کی شاعری میں نہ کوئی پیغام حیات ہے اور نہ فطرت کی ترجمانی، یہ صحیح ہے
کہ شوقی کے کلام میں ذاتیت کے بجائے 'غیریت' کا پہلو نمایاں ہے، لیکن یہ ان کا مذہب شاعری

---

[1] عمر الدسوقی: فی الادب الحدیث ج ۲ ص ۸۴ [2] شعرائے مصر و بیئاتہم فی الجیل الماضی ص ۱۵۶



اور فنی رجحان ہیں، شوقی نے اپنے رجحانات و جذبات کی ترجمانی کا دعوی کہیں نہیں کیا، بلکہ صرف
اپنے گرد و پیش کی دنیا کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے، اس لیے ان کو کسی ایسے پیمانہ سے
ناپنا ظلم ہوگا جسے وہ پسند نہیں کرتے تھے۔

شوقی کی شاعری میں جذبات و احساسات کی جھلک موجود ہے، لیکن یہ جذبات عمومی
و عوامی ہیں، ذاتی اور مخصوص نہیں، جن اشعار میں شوقی نے اپنی اولاد اور خاندان کا تذکرہ کیا ہے
ان میں البتہ یہ جذبات پوری طرح واضح ہیں، اپنی ایک سالہ لڑکی امینہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

امینتی فی عامها الا ... ول مثل الملک
کم خفق القلب لها ... عند البکا والضحک
وکم رعتها العین فی الـ ... سکون والتحرک
فان مشت فخاطری ... یسبقها کالممسک
الحظها کانها ... من بصری فی شرک

(ایک سالہ امینہ فرشتہ کے مانند ہے، یہ روتی یا ہنستی ہے تو دل دھڑکتا ہے، چلتے پھرتے نگاہ
اس کی نگرانی کرتی ہے، چلتی ہے تو دل اس کو پکڑنے کے لیے آگے جاتا ہے۔ میں اسے دیکھتا
رہتا ہوں، گویا وہ میری نگاہ کے جال میں ہے)

شوقی کے مرثیوں میں ان کا شعور بہت نمایاں ہے اور وہ سوز و درد اور رنج و غم کی
زندہ تصویر ہیں، ۱۸۹۵ء میں اپنے والد کی وفات پر جو مرثیہ لکھا، اس کے چند شعر یہ ہیں:-

ما أبی الا أخ فارقته ... وُدُّه الصدق وودّ الناس مین
طالما قمنا الی مائدة ... کانت الکسرة فیها کسرتین
وشربنا من اناء واحد ... وغسلنا بعد ذا فیه الیدین

وتمسّینا یدی فی یدہ — من رأنا قال عنا: اخوین

(باپ کی جدائی بھائی کی جدائی کے مانند ہے، اس کی محبت سچی تھی اور دوسروں کی محبت جھوٹی، ہم ایک ہی دسترخوان پر جاتے اور ایک ٹکڑے کو دو حصوں میں کر کے کھاتے تھے ایک ہی برتن سے پانی پیتے اور پھر اس میں ہاتھ دھوتے تھے۔

"غیریت" کو "ذاتیت" پر ترجیح دینے کی بنا پر یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ شوقی کی شاعری میں احساس اور ذاتی شعور کا فقدان ہے، البتہ اُن کے مدحیہ قصائد اور مرثیوں میں یہ چیز کچھ دھندلی ضرور ہے، لیکن ان کی تاریخی نظمیں اور قصیدے ان کے زندہ شعور اور حساس طبیعت کی زندہ مثال ہیں، یہ موضوع ان کے "غیریت" کے رجحان سے مناسبت رکھتا ہے، اسلیے اس میں ان کی طبیعت کی جولانی شباب پر ہوتی ہے اور وہ تاریخی واقعات کو زندہ جاوید بنا دیتے ہیں۔

شوقی سے پہلے بھی شعرائے تاریخی واقعات پر قصائد لکھے ہیں، ابن المعتز نے عباسی خلیفہ المعتضد باللہ کے دور کے واقعات کو، نشوان بن سعید الحمیری نے شاہانِ یمن کو، ابوطالب اندلسی نے انبیاء اور اسلامی حکومتوں کو، اور ابن الخطیب نے اسلامی ممالک کی تاریخ کو اپنے اپنے قصائد کا موضوع بنایا، اور اس کا بہت اچھا نمونہ پیش کیا ہے، لیکن ان شعراء کے قصیدوں میں وہ روح اور تاریخی واقعات کو صحیح طور پر سمجھنے کا وہ جذبہ موجود نہیں ہے جو شوقی کے قصیدوں میں ملتا ہے۔ شوقی نے "کبار الحوادث فی وادی النیل" (وادی نیل کے اہم واقعات) کے عنوان سے جو قصیدہ لکھا ہے وہ ان کے فن کا عمدہ نمونہ ہے، اس قصیدہ میں انھوں نے بانیان اہرام اور ان کے بعد کے بادشاہوں کے دور کی نہایت عمدہ تصویر پیش کی ہے، اور ایک مورخ کی طرح ان واقعات سے متعلق اپنا تاثر اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، ایک جگہ کہتے ہیں:-



وبنینا فلم نخل لبان — وعلونا فلم یجزنا علاء

وملکنا فالمالکون عبید — والبرایا بأسرہم اسراء

(ہم نے اپنی تعمیر سے تمام معماروں کو بیکار بنا دیا اور اس قدر بلند ہوئے کہ اسکے آگے بلندی کا تصور نہیں کیا جا سکتا، ہماری بادشاہت کے سامنے دوسرے بادشاہ غلام ہیں اور پوری مخلوق ہماری قیدی)

شوقی کا یہ قصیدہ ان کے دیوان کا سب سے اہم قصیدہ مانا جاتا ہے، اس قصیدہ نے جدید مصر کے آسمان پر اُن کے نام کو ہمیشہ کے لیے روشن کر دیا، اسی طرح کا ان کا دوسرا قصیدہ "النیل" کے عنوان سے ہے، جس میں انھوں نے فراعنۂ مصر کی تاریخ، ان کے آثار، مصریوں کے دینی رسوم، تابوت حضرت موسیٰ، یوسفؑ اور ان کے بھائیوں کا قصہ، مریم و عیسیٰ علیہما السلام کے واقعہ اور پھر وادی میں اسلام کے داخلہ کی طرف نہایت لطیف پیرایہ میں اشارہ کیا ہے، اور ان تمام واقعات کو اس خوش اسلوبی سے نظم کیا ہے کہ ان کی تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے، اس قصیدہ کے بارے میں ڈاکٹر شوقی ضیف لکھتے ہیں کہ اس عظیم شاعر کی یاد تازہ رکھنے اور اس کے فن کی قدر کرنے کے لیے ہر مصری کا فرض ہے کہ اس قصیدہ کو اپنے ملاقات کے کمرۂ خاص میں آویزاں رکھے۔[1]

شوقی نے قصر میں اور قصر سے باہر ہر جگہ اپنے فن میں اپنی شخصیت کے بجائے دوسروں کو زیادہ اہمیت دی، قصر شاہی سے علیحدگی کے بعد بھی انھوں نے اپنی ذات کی ترجمانی کے بجائے اپنے معاشرہ اور عوام کی ترجمانی کی راہ، چونکہ شوقی نے اپنے فن کے لیے اسی طرز کو اختیار کیا تھا، اس لیے اس باب میں ہم ان پر کسی طرح کا حرف نہیں رکھ سکتے، انھوں نے اپنے احساس و جذبات سے مصری عوام اور عرب دنیا کا ساتھ دیا، اور ان کی صحیح ترجمانی کی، اگر وہ اپنی انفرادیت و ذاتیت سے آزاد نہ رہتے تو قومی و تاریخی موضوعات میں اس بلند مقام پر ان کا پہنچنا مشکل تھا۔

[1] شوقی ضیف: شوقی شاعر العصر الحدیث ص ۵۶

**بدیہہ گوئی**

شوقی کی بدیہہ گوئی اور برجستگی پر تمام ناقدین کا اتفاق ہے، قصیدہ کہنے پر جب وہ آتے تو معانی کا ایک سیلاب ان کے ذہن میں امنڈ آتا تھا، شعر کی تخلیق کے لیے ان کا ذہن ودماغ ہمیشہ آمادہ رہتا تھا، ان کے یہاں آمد تھی آورد نہیں، شوقی کے دور میں روزنامہ الاہرام کے ایڈیٹر داؤد برکات لکھتے ہیں: "اگر صبح کو کوئی اہم واقعہ رونما ہوتا تو شام تک اس کے بارے میں شوقی کا کوئی قصیدہ اس واقعہ سے متعلق عوام میں آجاتا تھا، کیونکہ اس طرح کے واقعات ان کے دل ودماغ کو غیر معمولی طور پر متاثر کرتے تھے، اور ان کی طبیعت وخیالات میں زبردست ہیجان پیدا ہوجاتا تھا، وہ اکثر چلتے یا دوستوں میں بیٹھے ہوئے شعر کہہ لیا کرتے تھے، مجلس میں ان کا جسم دوستوں کے ساتھ رہتا اور ذہن ودماغ افکار وتخیلات کی دنیا میں کھوئے رہتے، شعر کہنے کے لیے کمرہ میں بیٹھکر سوچنے کی نوبت نہیں آتی تھی، اگر بیٹھتے تو صرف ذہن میں جمع شدہ اشعار کو لکھنے کے لیے بیٹھتے تھے۔[1]

اس بیان سے شوقی کی بدیہہ گوئی اور موزوں طبیعت کا پتہ چلتا ہے، کسی موقع پر شعر کہنے کے لیے انھیں کدوکاوش نہیں کرنی پڑتی تھی، بلکہ ذہن میں معانی کا ایک تسلسل قائم ہوجاتا تھا جنھیں وہ الفاظ کے ذریعہ شعر کے قالب میں ڈھالتے جاتے تھے، شوقی کے دوست خلیل مطران لکھتے ہیں: "شوقی دوستوں کی مجلس میں شعر کہتے رہتے تھے، کشتی میں، ریل میں اور سرکاری تقریبات میں بیٹھے بیٹھے وہ گنگنانے لگتے، آنکھوں میں چمک پیدا ہوتی، پیشانی سہلاتے اور سوچتے رہتے، اسی حالت میں کوئی کچھ پوچھ لیتا تو فوراً مناسب جواب بھی دیتے، پھر اسی وقت یا کئی دنوں کے بعد اس قصیدہ کو مکمل کرنے بیٹھتے تو پہلی مجلس کے تمام اشعار ان کے ذہن میں آجاتے اور اس طرح مہینوں پہلے کہے ہوئے اشعار اور نئے اشعار کو ایک ہی نشست میں قلمبند کرکے قصیدہ مکمل کرلیتے۔"[2]

---

[1] ذکری الشاعرین ص ۳۰۷ [2] مختارات المنفلوطی ص ۶۸



شوقی کی بدیہہ گوئی اور برجستگی کے بارے میں محمد کرد علی کا بیان ہے کہ: "دمشق کی علمی عربی اکیڈمی کی طرف سے شوقی کے اعزاز میں جو اجلاس منعقد ہوا اس میں پڑھنے کے لیے شوقی نے جو قصیدہ لکھا تھا وہ خود ان کو کچھ زیادہ پسند نہیں آیا، اس لیے وہیں برجستہ ایک دوسرا قصیدہ لکھ دیا، اور اتنا عمدہ لکھا کہ ان کے کمال کی داد دینی پڑتی ہے، اس قصیدہ کا ایک شعر ہے:

قم ناج جلّقَ وانشد رسمَ من بانوا — مشت علی الرسم احداث وازمان

شوقی کی اس بدیہہ گوئی کی وجہ سے ان کے شعر کہنے کے لیے کوئی مخصوص وقت نہیں تھا، ان کا ملکۂ شعر اس کے لیے ہر وقت آمادہ رہتا تھا، ان کے کاتب کا بیان ہے کہ وس سال پہلے ۱۹۲۲ء میں ایک دن ساڑھے گیارہ بجے شوقی گھر واپس ہوئے اور کمرہ میں آکر اٹھائیس[۲۸] شعر لکھوائے، پھر مجھ سے کہا کہ یہیں ٹھہرو، تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفہ سے پانچ پانچ چھ چھ شعر لکھواتے جاتے تھے، ایک بجے تک چوراسی شعروں کا ایک قصیدہ تیار ہوگیا۔ اس قصیدہ کا مطلع تھا:

قفی یا اخت یوشع خبّرینا

ان بیانات سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ شوقی کے یہاں آمد ہی آمد تھی، طبیعت کی موزونیت کی وجہ سے شعر گوئی ان کے لیے بالکل آسان تھی اور وہ لمبے لمبے قصیدے چند گھنٹوں میں مکمل کرلیتے تھے۔

اشعار پر نظر ثانی کی ضرورت بھی بہت کم ہوتی تھی، شعر اپنی مکمل و مہذب شکل میں ان کی زبان پر آتا تھا، اس میں اصلاح وترمیم کی ضرورت نہیں رہتی تھی، شوقی کے لکھے ہوئے جو مسودے موجود ہیں، ان میں لمبے لمبے قصیدوں میں صرف دو تین شعر اصلاح شدہ ملتے ہیں، البقیہ اشعار بغیر کسی ترمیم واصلاح کے ہیں، پھر جن اشعار میں ترمیم ہے اس سے بھی شوقی کے اعلیٰ ذوق اور بلند معیار کا پتہ چلتا ہے۔

قدیم رنگ — شوقی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ان کے پیشرو شاعر البارودی اور دوسرے عرب شعراء سے بڑا لگاؤ ہے۔ شوقی نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں متعدد قدیم شعراء کا والہانہ تذکرہ کیا ہے، مثلاً ابو فراس، ابو العلاء، ابو العتاہیۃ، العباس بن الاحنف، البہاء زہیر، متنبی کے سامنے تو وہ دست بستہ کھڑے نظر آتے ہیں، اس فہرست میں ابو نواس، ابو تمام، البحتری اور ابن الرومی کا نام نہیں ہے، لیکن شوقی ان سب سے واضح طور پر متاثر ہیں، بحتری اور ابو تمام کے تتبع میں تو ان کے بعض قصائد بہت مشہور ہیں۔ بحتری نے ایوانِ کسریٰ کی تعریف میں جو مشہور سینیہ قصیدہ لکھا ہے، شوقی نے اس کے تتبع میں اپنا طویل قصیدہ لکھا جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، یہ قصیدہ شوقی کے فن شاعری، منظر نگاری، دقت تعبیر، قدرت کلام اور عبقریت کا نمونہ ہے، اس کی فنی خوبیوں کو واضح کرنے کے لیے ایک مستقل مقالہ درکار ہے۔

انھوں نے قدیم شعراء کے تتبع میں جو اشعار کہے ہیں ان میں بھی کسی قسم کا جھول یا تکلف نہیں۔ ان کے قصیدوں میں عربی شاعری کی روح اور موسیقیت پوری طرح نمایاں ہے، شوقی نے جن خیالات میں دوسرے شعراء کا تتبع کیا ہے اُن میں وہ ان شعراء سے سبقت لے گئے ہیں، مصطفی الرافعی لکھتے ہیں: شوقی کا مشہور شعر ہے:

لک نصحی وما علیک جدالی      آفۃ النصح ان یکون جدالا

(میرا مقصد تمھیں نصیحت کرنا ہے جدل و جدال نہیں، کیونکہ جدال نصیحت کے لیے مہلک ہے)

دوسرے قصیدہ میں اسی مفہوم کو یوں ادا کیا ہے:

آفۃ النصح ان یکون جدالا      واذی النصح ان یکون جھارا

جھگڑا نصیحت کا ضیاع ہے، اور علانیہ نصیحت باعث تکلیف ہوتی ہے

یہ دونوں شعر شوقی کے ابتدائی زمانہ کے ہیں، اور ابن الرومی کے اس شعر سے ماخوذ ہیں:



وفی النصح خیر من نصیح موادع      ولا خیر فیہ من نصیح مواثب

(نرم رو ناصح کی نصیحت بہتر ہے، اور سخت گیر کی نصیحت میں کوئی خیر نہیں)

شوقی نے ابن الرومی کے شعر کے مفہوم تصحیح کرتے ہوئے "مواثبۃ" کی جگہ "جدال" کا لفظ استعمال کیا جو ابن الرومی سے نہ ہو سکا۔ شوقی کی تقلید بھی جامد نہیں ہے، بلکہ انھوں نے قدیم خیال کو نکھارا ہے، اس طرح شعر کا مفہوم خود ان کا اپنا نتیجہ فکر معلوم ہوتا ہے۔

عربی شاعری کا روایتی ڈھانچہ اس کی موسیقیت کے ساتھ دوسرے شعراء کے مقابلہ میں بحتری کے یہاں زیادہ نمایاں ہو، شوقی نے ایک طرف اس روایتی حیثیت کو برقرار رکھا، دوسری طرف جدید خیالات کو اپنی شاعری میں جگہ دی، اسی لیے ان کو جدید عربی شاعری کا "بحتری" کہا جاسکتا ہے، بحتری کے علاوہ شوقی نے متنبی کے ساتھ اپنے گہرے تعلق کا تذکرہ "شوقیات" کے مقدمہ میں بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے، یہی تعلق ان کو ابو العلاء سے بھی ہے، لیکن ان کے دیوان میں ابو العلا سے تاثر اتنا نمایاں نہیں جتنا متنبی سے ہے، اس کی وجہ دونوں شاعروں کا نفسیاتی اختلاف ہے، ابو العلاء کے مزاج میں یاس و قنوطیت اور تشاؤم تھا، اور شوقی کو حرماں نصیبی اور مایوسی کا سامنا بہت تھوڑے دنوں تک کرنا پڑا تھا، ابو العلاء کو زندگی، سیاست، حکام اور علماء سے نفرت اور بیزاری تھی، اور شوقی کو ان چیزوں سے کوئی تعلق نہیں تھا، اور ان کی زندگی اس طرح کی بیزاری اور فلسفیانہ الجھنوں سے پاک تھی، اس بنا پر شوقی کے کلام میں ابو العلاء کا کوئی واضح اثر نہیں ملتا، اس کے مقابلہ میں متنبی کے ساتھ ان کا تعلق انتہائی گہرا اور مضبوط ہے، شوقی پر تمام لکھنے والوں اور ان کے اور متقدمین شعراء کے درمیان موازنہ کرنے والوں کا اس پر اتفاق ہے، جس طرح متنبی نے اپنے اشعار میں حکم کو نمایاں جگہ دی ہے، اسی طرح شوقی نے بھی، کہتے ہیں:

والشعر ما لم یکن ذکری وعاطفۃ      او حکمۃ فھو تقطیع واوزان

یعنی اگر شعر میں جذبات، نصیحت اور حکمت کی بات نہ ہو تو وہ نرا وزن ہی وزن رہ جاتا ہے

شکیب ارسلان لکھتے ہیں کہ: متنبی کی تقلید اور تتبع میں شوقی کے کلام میں پیچیدگی اور تعقید بھی ملتی ہے، ترکیب کی ناہمواری اور ضمیروں کے اضطراب سے بعض جگہ شوقی کے کلام میں الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے، استعارہ و کنایہ کا خفا اور زیادہ مفہوم کو محدود و مختصر الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش بھی کہیں کہیں تعقید کا سبب بن گئی ہے۔[1]

ڈاکٹر شوقی ضیف لکھتے ہیں:

شوقی نے متنبی کو فن شاعری میں اپنا امام و پیشوا تسلیم کیا ہے، جس طرح متنبی سیف الدولہ کی مدح میں قصیدے لکھتا تھا، اسی طرح شوقی بھی بادشاہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے، اور اپنے فن کو اس کے لیے وقف کر دیا، متنبی کے قصیدوں میں حکمت و موعظت، اور معاشرہ پر تنقید وغیرہ کے نمونے بکثرت موجود تھے، شوقی نے ان تمام اصناف میں اس کا تتبع کیا، چنانچہ ان کے قصیدوں کا عام ڈھانچہ، ساخت و ترکیب اور حکم و امثال سب متنبی سے ملتا جلتا ہے، دونوں شاعروں کا یہ گہرا فنی ارتباط ان کے نفسیاتی ربط کا پتہ دیتا ہے۔

جس طرح شوقی دوسروں کی ترجمانی کرتے تھے، اور اس سے ان کا اتفاق ضروری نہیں تھا، اسی طرح متنبی بھی کافور وغیرہ کی مدح میں جو کچھ کہتا تھا، اس سے وہ نہ تو خود پوری طرح مطمئن ہوتا تھا، اور نہ اس کو اپنی زندگی میں برتنے کی ضرورت سمجھتا تھا۔[2]

عربی قصیدوں کی مخصوص ساخت میں جو موسیقیت اور نغمہ پایا جاتا ہے، وہ شوقی کے کلام میں بھی موجود ہے، اور عرب دنیا میں ان کی مقبولیت میں اسکو بڑا دخل ہے، شوقی نے اسی پرانے ساز پر نغمہ سرائی کر کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا جو ان کی فنی صلاحیتوں کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

(باقی)

---

[1] شکیب ارسلان: شوقی ص ۹۰ [2] ڈاکٹر شوقی ضیف: شوقی شاعر العصر الحدیث ص ۸۳



# پاکستان میں دو مہینے

از سید صباح الدین عبد الرحمن،

۱۹۶۵ء میں ہندوستان و پاکستان کی لڑائی کے بعد سے دونوں ملکوں میں تجارتی اور مالی لین دین بند ہو گیا تو دار المصنفین کی بہت سی مطبوعات پاکستان کے بعض ناشروں نے اجازت کے بغیر چھاپ لیں جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:-

(۱-۲) شعر الہند حصہ اول و دوم، از مولانا عبد السلام ندوی۔ ناشر عشرت پبلشنگ ہاؤس، اسپتال روڈ لاہور

(۳) گل رعنا، از مولانا عبد الحیٔ ،،

(۴-۵) مقالات شبلی، حصہ دوم و چہارم ،،

(۶-۷) شعر العجم حصہ اول و دوم از مولانا شبلی۔ ،، اسٹار بک ڈپو، اردو بازار لاہور

(۸) ،، حصہ سوم ،، ملک نذیر احمد، تاج بک ڈپو ،، ،،

(۹) ،، حصہ چہارم ،، حاجی فرمان علی اینڈ سنز ،، ،،

(۱۰) ،، پنجم

تاریخ اسلام مرتبہ مولانا شاہ معین الدین کے متعلق بھی خبر ملی تھی کہ اسکی چاروں جلدیں کوئی تاجر شائع کر رہا ہے، اسکی بھی اطلاع ملی کہ بعض ناشر سیرۃ النبی کی چھ جلدوں کا بلاک چھاپ رہے ہیں تاکہ ناواقف انکو دار المصنفین کی مطبوعہ سمجھیں۔

دار المصنفین کی آمدنی کا دار و مدار اس کی مطبوعات کی فروخت پر ہے، ۱۹۴۷ء کے سیاسی انقلاب کے

بعد ہندوستان میں اردو کتابوں کی بکری بہت کم ہوگئی ہے، ۱۹۶۵ء تک پاکستان دارالمصنفین کی کتابوں کی برآمد بکثرت ہوتی رہی، خیال ہوا کہ آگے چل کر کبھی کبھی دونوں ملکوں کے تعلقات اچھے ہوں گے اور تجارتی اور مالی لین دین ضرور ہوگا، پھر اس وقت جب کہ دارالمصنفین کی بہت کتابیں پاکستان کے بعض ناشر چھاپ چکے ہوں گے، اس کے لیے وہاں کا مارکیٹ ختم ہو چکا ہوگا۔ پہلے تو اس کے لیے احتجاج ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر سے کیا گیا، وہاں سے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا، کیونکہ ان کو خود شکایت تھی کہ پاکستان کی کتابیں ہندوستان میں بھی چھپتی رہتی ہیں، کراچی میں جناب سید حسام الدین راشدی صاحب دارالمصنفین کے بڑے قدردان ہیں، وہ اعلیٰ پایہ کے اہل علم ہیں، اسلیے پاکستان کے علمی حلقے میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، راقم نے ان کی توجہ بھی پاکستان کے بعض ناشروں کی دستبرد کی طرف دلائی، ان کو دارالمصنفین کے ساتھ اس بدسلوکی سے بڑا دکھ پہنچا، اور پاکستان کے اہم اخبارات مثلاً حریت، جنگ، مشرق، امروز، نوائے وقت وغیرہ میں اپنا ایک بیان شائع کرکے دارالمصنفین کو تباہی سے بچانے کی اپیل کی، اور اس کے لیے وہاں کے تمام ممتاز اہل علم کی امداد کے خواستگار ہوئے، ان کی اپیل سے دارالمصنفین کی حمایت میں وہاں اچھی فضا پیدا ہوئی، اخباروں نے اداریے لکھ کر ان کی ہمنوائی کی۔

جناب افضل اقبال صاحب آج کل پاکستان کی طرف سے سوئٹزرلینڈ میں سفیر ہیں، وہ پہلے ہندوستان میں پاکستان کی طرف سے ڈپٹی ہائی کمشنر تھے، پھر اسی عہدہ پر لندن بھیج دیے گئے، جہاں سے ترقی کرکے سوئٹزرلینڈ گئے، وہ دارالمصنفین کے علمی کاموں کے قدردان ہیں، اس کی طلائی جوبلی میں بھی ۱۹۷۵ء میں شریک ہوئے تھے، دارالمصنفین کو جو نقصان پاکستان کے بعض ناشر پہنچا رہے ہیں، ان کی بھی توجہ ایک خط کے ذریعہ سے اس کی طرف دلائی گئی، انھوں نے بھی دارالمصنفین کے ساتھ اس بدسلوکی سے پوری دلچسپی لی۔ جس کے بعد پاکستان کی حکومت کی طرف سے ایک آرڈیننس جاری ہوا کہ پاکستان کا



کوئی ناشر بیرونی مصنفوں کی کتابیں حکومت کی اجازت کے بغیر چھاپ کر فروخت نہیں کرسکتا،

ان ہمدردانہ کارروائیوں سے دارالمصنفین کی مطبوعات پاکستان کے بعض ناشروں کے دستبرد سے بظاہر تو محفوظ ہوگئیں، پھر بھی وہاں کے مخلص علمی دوستوں کا اصرار تھا کہ میں وہاں آؤں اور دارالمصنفین کی کتابوں کی جملہ حقوق محفوظ کرانے کی خاطر اور بھی مؤثر کارروائیاں کروں، دارالمصنفین کے قدردانوں اور مخلصوں میں مولانا عبدالوہاب جمال الدین صاحب ہیں، جو اپنے زمانہ کے مشہور رہنما اور مذہبی پیشوا مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے صاحبزادے ہیں، انھوں نے اب مستقل سکونت ڈھاکہ میں اختیار کرلی ہے، ان کا اصرار ہوا کہ میں پہلے ڈھاکہ آؤں، اور ان سے مل کر کراچی اور لاہور جاؤں، اس اثنا میں ڈھاکہ سے میرے بہت ہی شفیق اور محبوب چچا جناب سید قطب الدین صاحب کی تشویشناک علالت کا تار ملا، انھوں نے مجھکو جلد از جلد طلب کیا، اس لیے سفر میں عجلت کی کہ ایک پنتھ دو کاج ہو جائے گا۔

پٹنہ سے میرے ایک عزیز افضال کریم سلمہ ساتھ ہوگئے، تاکہ وہ مجھکو اس طویل سفر میں مدد پہنچائیں، ۱۲/ اکتوبر کو ہم دونوں کلکتہ پہنچے، پہلے تو ہمارے میزبان جناب اسحٰق صاحب عرف مولانا ہوئے، جو خاص کلکتہ کے رہنے والے ہیں، بہت ہی خلیق اور متواضع ہیں، علمی ذوق بھی رکھتے ہیں، انھوں نے ہمارے قیام کا انتظام بھول بگان میں انجمن مفید الاسلام کی ایک عمارت میں کیا، یہ انجمن ۱۹۰۹ء سے کلکتہ میں قائم ہے، پہلے تو اس کا کام لاوارث مسلمان مردوں کی تجہیز و تدفین کرنے تک محدود تھا، لیکن اب اسکی نگرانی میں ایک یتیم خانہ، مسلمان لڑکیوں کا ایک پرائمری اسکول اور دو ہائی اسکول بھی ہیں، ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۶ء تک میرے چھوٹے چچا جناب سید صلاح الدین صاحب بی اے اس کے روح رواں رہے، اب وہ ڈھاکہ چلے گئے ہیں، جہاں اسی قسم کی ایک انجمن قائم کی ہے، بھول بگان، ہاتھی بگان، تانتی بگان اور انٹالی کے مسلمان اب تک ان کے بہت مداح ہیں، ان کو بہت محبت اور عزت سے یاد کرکے انکی کمی کو محسوس کرتے ہیں، آج کل انجمن مفید الاسلام کے نگران اعلیٰ حاجی غلام رسول ہیں، جو ہڈی کی تجارت کرتے ہیں، بہار کے رہنے والے ہیں، مسلمانوں کے رفاہی کاموں میں آگے آگے رہتے ہیں، معلوم ہوا کہ روزانہ ان کے یہاں

حاجتمندوں کی ایک بھیڑ لگی رہتی ہے، اور وہ سب کی ضرورتیں کسی نہ کسی طرح پوری کرتے رہتے ہیں، ان سے معلوم ہوا کہ انجمن کے گرل اسکول میں نو برس کی بچیوں کو بھی برقعہ پہننا لازمی ہے، اس کے نصاب میں زیادہ تر اسلامی کتابیں رکھی گئی ہیں، اس لیے حکومت اور کارپوریشن سے امداد نہیں ملتی ہے، ایک اسکول کا خرچ سات ہزار ماہانہ ہے، جو مسلمانوں کے عام چندوں سے پورا ہوتا رہتا ہے۔

انجمن مفید الاسلام میں کلکتہ کے مشہور امینیہ ہوٹل کے مالک حاجی عبد القیوم صاحب سے ملاقات ہوئی، وہ دریاباد ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے ہیں، دار المصنفین کے قدردان ہیں، اس لیے وہ اصرار کرکے مجھکو میرے عزیز کے ساتھ اپنے ہوٹل میں لے آئے جو نیو مارکٹ میں واقع ہے، انھوں نے خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، اپنے کاروبار میں مشغول رہنے کے باوجود دل میں مسلمانوں کا درد رکھتے ہیں، اس لیے حاجی غلام رسول کے ساتھ عام مسلمانوں کے رفاہی کاموں میں برابر شریک رہتے ہیں۔

کلکتہ میں پاکستان کے لیے ویزا حاصل کرنا بہت صبر آزما کام ہے، میرے پاس کچھ سفارشی خطوط تھے خیال تھا کہ ان کی مدد سے ویزا ملنے میں زیادہ دقت نہ ہوگی، پھر بھی اس کے لیے کلکتہ میں پانچ روز قیام کرنا پڑا، حاجی عبد القیوم صاحب اور اسحٰق صاحب عرف مولانا کی خاطر و مدارات سے یہ قرنطینہ گراں نہیں گزرا، ورنہ پانچ روز کا وقت کاٹنا بہت تکلیف دہ ہو جاتا، اس اثنا میں کلکتہ کے بعض خاص خاص اہل علم سے ملتا رہا، کلکتہ کی ایران سوسائٹی کے بانی اور روح رواں ڈاکٹر محمد اسحٰق (جن کو مرحوم لکھتے ہوئے بہت دکھ ہوتا ہے) مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے، ان ہی کے اصرار پر میں ان کے انگریزی رسالہ انڈو ایرانیکا میں برابر مضامین لکھتا رہا، انھوں نے کئی بار لکھا تھا کہ جب میں کلکتہ آؤں تو ان ہی کے ساتھ قیام کروں، ستمبر کے شروع میں ان کو ایک خط لکھا کہ میں پاکستان جاتے ہوئے کلکتہ میں ان کے ساتھ قیام کروں گا، لیکن اس کے جواب میں ان کی اہلیہ نے یہ المناک خبر دی کہ وہ ۱۹ ستمبر کو حرکت قلب بند ہو جانے سے اللہ کو پیارے ہوئے، یہ معلوم کرکے مغموم اور افسردہ ہوا، کلکتہ میں ان کی تعزیت کرنی ضروری تھی، مگر



ان کے کوئی اولاد نہیں ہے، اسلیے انڈو ایرانیکا کے مینجنگ ایڈیٹر اور ایران سوسائٹی کے وائس پریسیڈنٹ خواجہ محمد یوسف صاحب کی دعوت پر ان کے گھر پر گیا، وہ ۴۸-سی نارتھ مینج میں رہتے ہیں جو مسلمانوں کا محلہ ہے، کلکتہ یونیورسٹی سے اسلامک کلچر میں ایم اے کرکے وکالت کی ڈگری حاصل کی، اب وہاں ہائی کورٹ کے کامیاب ایڈوکیٹ ہیں، عمر ابھی زیادہ نہیں ہے، پچاس کے اندر ہی ہیں، ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم کے دست راست تھے، اپنے پیشے کی مشغولیت کے باوجود ایران سوسائٹی کے کاموں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں، ان کے یہاں پہنچا تو دیر تک ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم کی گوناگوں خوبیوں کا ذکر رہا، وہ ایران سوسائٹی تھے اور ایران سوسائٹی ڈاکٹر اسحٰق تھی، ان کا واحد مشغلہ اس کے لیے دن رات کام کرنا تھا، وہ کوئی معاوضہ بھی نہیں لیتے تھے، بلکہ اس میں اپنا ہی سرمایہ لگاتے رہے، ان پر میرا ایک مضمون مارچ ۱۹۷۰ء کے معارف میں شائع ہو چکا ہے، خواجہ محمد یوسف صاحب کے یہاں کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر ڈاکٹر عطا کریم برق سے بھی ملاقات رہی، وہ ایران میں کئی سال تک رہ چکے ہیں، فارسی زبان کے سبک ہندی پر گفتگو آئی تو وہ کہنے لگے کہ اب ایران کا ادبی طبقہ اس کی طرف رفتہ رفتہ مائل ہوتا جا رہا ہے، وہاں کے مشہور شاعر بہار اور دوسرے ارباب نظر مثلاً کوہی فیروزی وغیرہ کو اس سے دلچسپی ہو رہی ہے، خواجہ محمد یوسف صاحب کے ساتھ ایران سوسائٹی بھی گیا، جو ۱۲-کِڈ اسٹریٹ میں واقع ہے، یہ اب سے پچیس سال پہلے ۱۹۴۴ء میں قائم ہوئی، اس کی عمارت اچھی خاصی بڑی ہے، سامنے ایک چھوٹا سا میدان بھی ہے، اوپر کئی منزلیں ہیں، ۱۲ کمرے ہیں، یہ کسی مسلمان کی ملکیت تھی، اس کو ایران سوسائٹی نے ۱۹۶۰ء میں تین لاکھ میں خرید لیا ہے، اس وقت اس کی قیمت اس سے چار گنی زیادہ ہو گئی ہوگی، اوپر کرایہ دار ہیں، نیچے رسالہ انڈو ایرانیکا اور ایران سوسائٹی کا دفتر ہے، اس میں فارسی کا کلاس بھی ہوتا ہے، اس کے مدرس ایک ایرانی محمد مہدی شجاعی ہیں، جو حکومت ایران کی طرف سے یہاں بھیجے گئے ہیں، اس کا کتب خانہ ابھی زیادہ بڑا نہیں ہے،

اس مفید ادارہ کو کہیں سے بڑی سالانہ امداد اس وقت نہیں ملتی ہے، اس کو انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز نئی دہلی کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد اور پروفیسر ہمایوں کبیر کی وزارت کے زمانے میں بارہ ہزار سالانہ کی امداد ملتی تھی، لیکن اب وہ بند ہوگئی ہے، حکومت ایران، حکومت مغربی بنگال اور کلکتہ کارپوریشن کی طرف سے کچھ امداد مل جاتی ہے لیکن وہ بہت ہی ناکافی ہے۔ مثلاً ۱۹۶۷ء میں نئی دہلی کے ایرانی سفارت خانہ کے کلچرل کانسلر کی طرف سے دو ہزار، مغربی بنگال کی وزارت تعلیم کی طرف سے پانچ سو اور کلکتہ کارپوریشن کی طرف سے تین سو ترانوے روپے کی امداد ملی، اس سوسائٹی کے صدر رام رائے کاشانی صاحب ہیں جو کلکتہ میں حکومت ترکی کی طرف سے آنریری کونسل جنرل بھی ہیں، وہ اسکو ضرورت کے وقت قرض بھی دیا کرتے ہیں، بنگالی ہندوؤں کو بھی اس سے دلچسپی ہے، اس وقت اسکے نائب صدر مسٹر اس، ان مدوک آئی، سی، ایس (ریٹائرڈ) ہیں، اس کے کانسل کے ممبروں میں جے، ان تلکدار (آئی، سی، ایس ریٹائرڈ) اور ڈاکٹر جین ائی دت بھی ہیں، مشہور بنگالی اسکالر اور انڈولوجی کے بہت بڑے ماہر پروفیسر سنیتی کمار چیٹرجی بھی اس کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں، اس کی علمی سرگرمیوں کی شہرت ہندوستان سے باہر کے ممالک بھی پھیل رہی ہے، خواجہ محمد یوسف صاحب نے اس کی تمام چیزیں بڑی محبت سے دکھائیں، وہ چار گھنٹے ساتھ رہے، ان سے پہلی ملاقات تھی لیکن وہ بہت جلد اس طرح گھل مل گئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان سے دیرینہ عزیزانہ تعلقات ہیں، اس کے موجودہ عارضی جنرل سکریٹری ام، اے مجید صاحب ہیں، جو سرکاری ملازم ہونے کے باوجود سوسائٹی کے کاموں سے پوری دلچسپی لیتے ہیں، خواجہ محمد یوسف صاحب ان کی خوبیوں کے بھی معترف تھے، ان سے بھی مل کر خوشی ہوئی، ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم کے بعد اس سوسائٹی کو کامیابی سے لے چلنے کا بار ان ہی دونوں صاحبوں پر ہے۔

ایک روز شام کو ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی کے یہاں گیا، انھوں نے ۱۹۳۶ء میں مجھکو ہندوستان کے صوفیائے کرام اور ان کی تصانیف پر پی، ایچ، ڈی کا ایک مقالہ لکھنے پر آمادہ کیا تھا، وہ اس وقت



کلکتہ یونیورسٹی میں آشوتوش مکرجی پروفیسر آف اسلامک اسٹڈیز تھے، ان ہی کی ترغیب سے میں کلکتہ یونیورسٹی میں پی، ایچ، ڈی کا طالب علم بھی ہوگیا تھا اور یہ مقالہ بڑی حد تک مکمل بھی ہوگیا تھا، لیکن یکایک خیال آیا کہ ان بزرگانِ دین کو دنیاوی فوائد کے لیے استعمال کرنا مناسب نہیں، اس لیے اس کے ذریعہ پی، ایچ، ڈی حاصل کرنے کا خیال ترک کر دیا، اور یہی کتاب بزم صوفیہ کے نام سے دار المصنفین سے شائع ہوئی، ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب نے ۷- سہروردی ایونیو میں بہت بڑا مکان بنا لیا ہے، عرصہ ہوا کہ ریٹائر ہوکر اسی میں رہتے ہیں، ابھی تک علمی کام کرتے رہتے ہیں، اس لیے علمی حلقہ میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، گفتگو بھی دلچسپ کرتے ہیں۔ انھوں نے افضل اقبال صاحب (سابق ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان نئی دہلی) کی ایک کتاب کلچر آف اسلام دکھلائی، میں نے یہ نہیں دیکھی تھی، ان کے پاس یہ کتاب لاہور سے ریویو کے لیے آئی ہوئی تھی، انھوں نے اس کا پورا مطالعہ کر ڈالا تھا، جہاں جہاں ان کو اختلاف تھا وہاں نشانات لگا رکھے تھے۔

ایک شام کو پروفیسر مسعود حسن صدر شعبۂ عربی، کلکتہ کالج کے یہاں بھی نشست رہی جس میں خواجہ محمد یوسف، ڈاکٹر عطا کریم برق، سید محمد علی صاحب کپور میر زولوجکل سروے اور محمد اسحٰق صاحب عرف مولانا بھی شریک تھے، مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی لیکن بار بار یہ سوال آیا کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے آپ کو کس طرح سنبھالیں، اسی نشست میں یہ معلوم ہوا کہ کلکتہ یونیورسٹی میں اسلامک کلچر اور ہسٹری کے شعبہ میں زیادہ تر ہندو اساتذہ ہیں، صرف ایک مسلمان لکچرار ہے، طلبہ اور طالبات میں بھی ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہے۔

۲۰ اکتوبر کو کلکتہ سے ڈھاکہ کو روانگی ہوئی، وہاں جانا اب آسان کام نہیں، پہلے پاکستان کی ریل گاڑی سیالدہ اسٹیشن سے چھوٹتی تھی جس سے سفر کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی تھی لیکن

۱۹۶۵ء کے بعد سے اس ریل گاڑی کا آنا جانا بند ہو گیا ہے، پہلے کلکتہ سے ڈھاکہ ہوائی جہاز بھی آیا جایا
کرتا تھا جس سے ایک گھنٹہ کے اندر یہ سفر تمام ہو جاتا تھا، یہ سروس بھی اب بند ہو گئی ہے، سیالدہ
سے ہم لوگ ۹ بجے دن کو ایک لوکل ٹرین میں بن گاؤں روانہ ہوئے، جو چوبیس پرگنہ میں ہے،
یہاں ساڑھے گیارہ بجے دن کو پہنچ گئے، وہاں سے رکشے پر ۸ میل کی مسافت طے کر کے ہندوستان
و پاکستان کے چک پوسٹ پر تقریباً دو بجے دن کو پہنچے، جہاں سے جیسور پچیس میل ہے، وہاں جاکر
ہوائی جہاز میں ڈھاکہ تک سفر کرنا تھا، ایک ٹیکسی پر جیسور پانچ بجے تک پہنچ گئے، بن گاؤں سے
جیسور تک سڑک بہت اچھی ہے، اس کے دونوں طرف مسلسل گھنے دار درخت لگے ہوئے ہیں،
اس پر چلنے میں ٹھنڈی سڑک کا لطف ملتا ہے، یہ وہی مشہور شاہراہ ہے جس کو شیر شاہ نے پشاور
سے سنار گاؤں تک بنوائی تھی۔

ہم دو آدمی تھے، اس لیے دونوں حکومتوں کے قاعدے کے مطابق ہمارے پاس بیس بیس
روپے تھے، اتنی چھوٹی رقم کے ساتھ یہ مشکل اور دور دراز سفر طے کرنا آسان نہیں، معلوم نہیں کس
مصلحت سے اتنی قلیل رقم کی تعیین کی گئی ہے، ہوائی جہاز کے ٹکٹ کا انتظام ڈھاکہ سے کرنا پڑا تھا،
جیسور سے ڈھاکہ ۴۰ منٹ میں پہنچ گئے، ریل سے سفر ۱۴ گھنٹے میں طے ہوتا ہے، اس طرح ہوائی جہاز کا سفر مختصر اور خوشگوار
رہا، ڈھاکہ اپنی قیام گاہ پر آٹھ بجے رات تک پہنچ گئے، یہاں اپنے اعزہ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی، وہ اپنے ہی گوشت پوست
ہیں لیکن قانون کی نظر میں اب ہم اور وہ غیر ملکی ہیں، تکان کے باوجود بچھڑوں کی باتیں ایک بجے رات تک ہوتی رہیں ہم محترم
اپنی تشویشناک علالت کے بعد رو بصحت ہو رہے تھے، جس سے اطمینان ہوا۔

دوسرے دن صبح کو مولانا جمال میاں فرنگی محلی کے یہاں ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کہ رابطہ
اسلامیہ کی دعوت پر مکہ معظمہ تشریف لے گئے ہیں، لیکن جلد ہی واپس ہوں گے، ان کا انتظار کرنا
ضروری تھا، اسی روز پاکستان کے چار اخبارات پڑھنے کا موقع ملا، دو انگریزی، دو اردو، انگریزی



پاکستان آبزرور اور مارننگ نیوز، دونوں بارہ صفحے کے تھے، پاکستان آبزرور کے اڈیٹر عبدالسلام صاحب
ہیں اور مارننگ نیوز کے اڈیٹر سید محسن علی صاحب ہیں، پاکستان آبزرور بنگالی مسلمانوں میں مقبول ہے،
مارننگ نیوز مہاجروں کے حلقے میں زیادہ پڑھا جاتا ہے، دونوں ڈھاکہ ہی سے نکلتے ہیں، اردو کا اخبار
ہماری آواز بالکل نیا ہے، اردو بولنے والے مہاجروں کا آرگن ہے، اس کا معیار ابھی اونچا نہیں ہے،
ڈھاکہ ہی سے نکلتا ہے، دوسرا اخبار جنگ کراچی سے آتا ہے، اس کے اڈیٹر خلیل الرحمن اور اگزیکیٹو اڈیٹر
یوسف صدیقی صاحب ہیں، جاوید پریس میکلوڈ روڈ کراچی سے شائع ہوتا ہے، ہندوستان اسٹیٹسمین سائز کی طرح دس صفحے کا
ہوتا ہے، ٹائپ کے بجائے نستعلیق حروف میں لکھا ہوتا ہے، چھپا تو بہت عمدہ ہے لیکن حروف بہت باریک
ہوتے ہیں، اس میں رنگین تصویریں بھی شائع ہوتی ہیں، پاکستان کا بہت ہی کثیر الاشاعت اخبار
ہے، ایک صاحب نے بتایا کہ ڈیڑھ لاکھ چھپتا ہے، اس کے اڈیٹوریل کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے،
اڈیٹوریل کے بغل میں ایک مستقل کالم وغیرہ کا ہوتا ہے، اس میں مستقل طور پر ابراہیم جلیس صاحب
مزاحیہ رنگ کی تحریریں لکھا کرتے ہیں، تلخ و شیریں کے عنوان سے انعام درانی گلفشانی کرتے رہتے
ہیں، رئیس امروہوی صاحب کی ایک رباعی روزانہ شائع ہوا کرتی ہے، جس میں سیاسی رنگ
غالب ہوتا ہے، ایک روز اس میں یہ رباعی پڑھی،

سچ مچ کے جو لوگ ہیں مسلماں — وہ لوگ تو چند رہ گئے ہیں
باقی تو فقط بہ حسبِ اعلان — اسلام پسند رہ گئے ہیں

میں پہلی بار ڈھاکہ ۱۹۵۱ء میں آیا تھا، اس وقت یہ شہر بہت زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا، کلکتہ کے
مقابلہ میں یہ محض ایک قصبہ معلوم ہوتا تھا، دوسری بار ۱۹۶۳ء میں آیا تو اس کی شکل بہت بدل گئی
تھی، اب ۱۹۶۹ء میں آیا تو اس کی بہت سی سڑکوں پر کلکتہ ہی جیسی رونق اور چہل پہل پائی،
موتی جھیل، جناح ایونیو، اسٹیڈیم، دھان منڈی، گلشن اور نیو اسکاٹن میں تو بہت سی

خوبصورت عمارتیں بن گئی ہیں، ایک دن اپنے چھوٹے چچا جناب سید صلاح الدین صاحب کے ساتھ ہائی کورٹ چلا گیا، اس کی نئی عمارت بہت شاندار ہے، لیکن بلندی کی کمی محسوس ہوئی، عمارت کا پورا فرش موزیک کا ہے، یہاں کی نئی عمارتوں میں موزیک کی بڑی فراوانی دیکھی، چیف جسٹس کے کورٹ کے اندر گیا، بڑا وسیع ہال تھا، جو ہر طرح آراستہ تھا، وکلاء اور ججوں کا لباس وہی تھا جو ہندوستان کے ہائی کورٹ میں ہے، عمارت کے بیچ میں وسیع لان تھا، اس کی گھاس اچھی نہیں تھی، موتھے بکثرت تھے، لیکن مالیوں نے ان کو کاٹ کر برابر کر رکھا تھا جس سے دیکھنے میں پورا لان بھلا معلوم ہوتا تھا، دوسرے دن ڈھاکہ ہائی کورٹ کے جسٹس محمود حسین صاحب کے یہاں جانے کا اتفاق ہوا، وہ اپنی سفید لمبی داڑھی میں بہت متشرع معلوم ہوئے، سلہٹ کے رہنے والے ہیں، اردو صاف اور اچھی بولتے ہیں، باتیں شروع ہوئیں تو میں نے کہا کہ آپ کے ہاں ہائی کورٹ کی عمارت خوبصورت اور شاندار ہے، کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ جیسا اس کا ظاہر ہے ویسا اس کا باطن بھی ہو جائے، گفتگو چل نکلی تو بولے کہ مسلمانوں کا بھی عجیب حال ہے، حافظ شیرازی کی موت ہوئی تو کچھ لوگوں نے کہا کہ وہ کافر مرا، اور ان کے جنازہ کی نماز پڑھنے سے انکار کیا، لیکن ان کے دیوان سے فال نکالی گئی تو یہ شعر نکلا:

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظ
کہ اگرچہ غرق گناہ ست می رود بہشت

پھر کہنے لگے کچھ مسلمان مولانا روم کو بھی مسلمان نہیں سمجھتے ہیں، خدا ایسے مسلمانوں پر اپنا فضل رکھے،

جمعہ کے روز ڈھاکہ کی مشہور مسجد بیت المکرم میں نماز پڑھنے گیا، جو یہاں کی جامع مسجد ہے، بالکل ہی نئے طرز کی سہ منزلہ عمارت ہے، ہر منزل پر جماعت کھڑی ہوتی ہے، اس میں دہلی کی جامع مسجد کی طرح لمبا صحن نہیں ہے، اور نہ گنبد ہے، دھوپ سے بچنے کے لیے اس میں شامیانہ ڈالنے کی ضرورت



نہیں ہوتی، بیچ میں ایک بڑا ہال ہے، وہیں امام صاحب کی امامت کی جگہ بنی ہوئی ہے، اس کے اوپر اور نیچے کے حصوں میں دکانیں ہیں، جن سے کافی آمدنی ہوتی ہوگی، اس کا ایک کتب خانہ بھی ہے، تمام فرش موزیک کا ہے، امام صاحب کے لیے ایک علیحدہ کمرہ بھی ہے، جہاں ان سے لوگ فیوض و برکات حاصل کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں، موجودہ امام صاحب کا اسم گرامی مولانا عمیم الاحسان ہے، پہلے ان کا وطن بہار شریف ضلع پٹنہ تھا، میں ۱۹۲۶ء میں پٹنہ میں ایک بڑا آپریشن کرا رہا تھا، تو میرے ایک محترم عزیز جناب سید محمد انیس صاحب نے ان سے میرے لیے دعائیں کرائی تھیں، اسلئے میں ان سے جذبۂ ممنونیت کے ساتھ ملا، وہ دار المصنفین سے اچھی طرح واقف تھے، اسلئے بڑی خندہ پیشانی سے ملے، دیر تک گفتگو ہوتی رہی، انھوں نے بتایا کہ اردو اور بنگلہ میں ان کی تقریباً اسی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جمعہ کی نماز کا وقت آیا تو وہ اپنے حجرہ سے باہر نکلے، ایک عصا بردار مرصع عصا لیے آگے آگے چلا، وہ سب سے مصافحہ کرتے ہوئے منبر تک پہنچے، خطبہ کچھ تحت اللفظ اور کچھ قرأت کے ساتھ پڑھا، ان کے پڑھنے کا انداز اچھا اور موثر تھا، مگر لاؤڈ اسپیکر اچھا نہ تھا، اس لیے آواز کبھی کبھی ناصاف ہو جاتی تھی، مقتدی دس ہزار سے کم نہ رہے ہوں گے۔

اسی روز شام کو خبر ملی کہ بنگالیوں اور اردو بولنے والے مہاجروں میں تناؤ پیدا ہو گیا ہے، دونوں کے تعلقات خراب ہو رہے ہیں، اردو بولنے والے مہاجروں کا مطالبہ یہ تھا کہ آئندہ انتخاب کے لیے ووٹر بنانے کیلئے نئے فارم اردو میں بھی چھپائے جائیں، چیف الیکشن کمشنر کی طرف سے اعلان ہوا کہ مشرقی پاکستان میں بنگالی کے علاوہ اردو میں فارم دینے سے انتظامیہ کی مشکلات بڑھ جائیں گی۔ اردو بولنے والے مہاجروں نے حکومت کے خلاف احتجاج کرنے کی خاطر ڈھاکہ میں محمد پور اور میرپور کے علاقوں میں دکانیں بند کیں اور کرائیں، یہ جھگڑا دراصل مہاجروں اور حکومت کے درمیان تھا، لیکن بنگالیوں اور اردو بولنے والے مہاجروں کے جھگڑے کی شکل میں تبدیل ہو گیا، گھر سے باہر نکلنا

مشکل ہو گیا، ۲ رنومبر سے کئی روز تک خاص خاص اوقات میں کرفیو لگا رہا، ۳ رنومبر کی صبح کو اخبار ملا تو اس میں یہ خبر تھی کہ چھ آدمی ہلاک ہوئے، یہ خبر پڑھ کر بڑا دکھ ہوا کہ جب پاکستان میں مسلمان مسلمان سے لڑ کر ہلاک ہوتے ہیں تو پھر ہندوستان میں ہندو مسلمان لڑتے ہیں تو وہاں کیا شکایت ہو سکتی ہے، طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں، بنگالیوں اور غیر بنگالیوں دونوں کی زبان پر تھا کہ ان کے آدمی زیادہ مارے گئے، مجھکو کرفیو سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا، ہر طرف ہو کا عالم چھایا ہوا تھا، فوجی ٹرک گذرتا تو اس کی صرف آواز کانوں میں پڑتی، ۲ رنومبر سے ۸ رنومبر تک فضا بڑی مکدر رہی، اخبارون میں مارننگ نیوز اور پاکستان آبزرور دونوں کا لب ولہجہ صلح کل تھا، لیڈروں کے بیانات میں بھی امن و آشتی کا پیام ہوتا، بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے ملے جلے جلوس بھی نکلے، اور مسلمان بھائی بھائی کے نعرے لگائے گئے، پاکستان آبزرور کے اڈیٹر عبد السلام صاحب کا ایک اچھا مضمون بھی شائع ہوا جس میں انھوں نے اس جھگڑے کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا، بنگالیوں اور غیر بنگالیوں دونوں پر الزامات عائد کیے، اردو بولنے والے مہاجروں کو مخاطب کر کے لکھا کہ وہ اپنے کلچر کے احساس برتری میں مبتلا ہیں، اور بنگالیوں کی طرف روئے سخن کر کے لکھا کہ ان میں تنگ نظری آگئی ہے، اردو بولنے والے مہاجروں سے اپیل کی کہ وہ احساس برتری کو چھوڑ کر بنگلہ زبان ضرور سیکھیں، بنگالیوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اردو زبان ضرور سیکھیں، کیونکہ اردو زبان بھی ان کے کلچر کا ایک ضروری حصہ ہے، اس کے علاوہ مشرقی پاکستان کے لوگ اردو سیکھے بغیر مشرقی پاکستان کو عظیم تر نہیں بنا سکتے، پاکستان آبزرور میں وہاں کے مشہور رہنما حمید الحق چودھری صاحب کا بھی ایک مضمون شائع ہوا جس میں انھوں نے مشرقی پاکستان کے تمام لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ یہ تصادم محض اس لیے ہوا کہ ان میں رواداری، وطنیت اور عزت نفس وغیرہ کا فقدان ہو گیا ہے، لیکن ایک بنگالی اخبار پوربودیش کا لب ولہجہ اچھا نہ تھا، اس کے ایک مضمون کا اردو ترجمہ



مہاجروں کے اخبار بہاری آواز میں چھپا، اس میں یہ لکھا گیا تھا کہ مہاجروں کو مشرقی پاکستان میں جگہ دے کر ان پر بڑا احسان کیا گیا ہے، اس لیے ان کو بنگالیوں کے سامنے جھکا رہنا چاہئے، اور وہ اپنے لائے ہوئے کلچر کو خیرباد کہہ کر بنگالیوں میں ضم ہو جائیں، پاکستان آبزرور کے ایک اڈیٹوریل سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کچھ اشتہارات ایسے بھی بنگالی زبان میں چھپے جن میں بنگالیوں کو یہ تلقین کی گئی تھی کہ وہ اردو بولنے والوں کو بالکل ختم کر دیں، پھر ایسے اشتہارات بھی تقسیم کیے گئے جن میں بنگالی جاگو اور بہاری بھاگو کا بھی نعرہ بلند کیا گیا، وہاں کے ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار دی پیوپل کے ایک مضمون کو بھی پڑھنے کا اتفاق ہوا جس میں فساد کی ساری ذمہ داری مہاجروں پر ڈال دی گئی تھی، اسکے مضمون نگار کو شکایت تھی کہ ان کو حکومت نے محمد پور اور میرپور میں اجتماعی طور پر بسا کر سخت غلطی کی، ان کو منتشر رکھنا چاہیے تھا، تاکہ وہ بنگالیوں میں رفتہ رفتہ ضم ہو جاتے، مضمون نگار نے یہ بھی لکھا کہ مہاجروں کو بسا کر بنگالیوں پر بڑا اقتصادی بار پڑ رہا ہے، اور ان کو کروروں روپئے مہاجروں کی خاطر ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے، یہ مضمون مہاجروں کے لیے بڑا تلخ تھا، بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کی اس اعصابی جنگ میں کچھ مہاجروں کے حوصلے پست ہو گئے ہیں، اور وہ سمجھنے لگے ہیں کہ ان کا مستقبل مشرقی بنگال میں تاریک ہے، لیکن کچھ مہاجر ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان چھوڑ کر تو یہاں آئے، اب یہاں سے کہاں جائیں، ان کے جذبات کی ترجمانی کرنے کے لیے ان کی ایک تنظیم بھی قائم ہے، اس کا ایک کنونشن ۳۱ اکتوبر کو رنگ پور میں ہوا تھا جس میں یہ مطالبے کیے گئے تھے، (۱) مشرقی پاکستان کے اردو بولنے والے طلبہ کے لیے ذریعۂ تعلیم اردو ہو، ڈھاکہ یونیورسٹی کی طرح چاٹگام اور راج شاہی یونیورسٹیوں میں بھی اردو کے شعبے قائم کیے جائیں (۲) پالی ٹکنک، میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں میں مہاجروں کے بچوں کے لیے نشستیں مخصوص کر دی جائیں (۳) ایسے مقامات پر جہاں مہاجروں کی کثیر آبادی ہے، مثلاً میرپور، محمد پور، ایشور ڈیہہ، خالص پور، بونر پاڑا، اور بوگرا وغیرہ میں پرائمری سے لیکر کالج تک

تعلیم اردو میں ہو، سید پور کے ٹیکنیکل ہائی اسکول میں اردو کو بھی مساوی حیثیت دی جائے (۴) ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں بنگلہ کے ساتھ اردو کو مساوی حیثیت دی جائے (۵) فوج، پولیس، عدلیہ، انتظامیہ اور دوسری ملازمتوں میں مہاجر امیدواروں کے لیے کوٹہ مخصوص کیا جائے، وغیرہ وغیرہ۔

اخبار میں ان تجویزوں کو پڑھ کر مجھکو ایسا محسوس ہوا کہ میں پاکستان کا کوئی اخبار نہیں پڑھ رہا ہوں بلکہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے ہندوستان کے کسی مسلم اخبار کا مطالعہ کر رہا ہوں، ایک روز مہاجروں کے ارگن ہماری آواز کے نامہ نگار حفیظ الحق سے ملاقات ہوئی، وہ بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے جھگڑوں پر دیر تک تبصرہ کرتے رہے، ان کی گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ پاکستان کی صورت حال اس لیے بگڑتی چلی جا رہی ہے کہ قائد اعظم نے پاکستان کے بنیادی تصورات کے ساتھ جو مذہبی، اخلاقی، قومی اور وطنی فضا تیار کی تھی، وہ ان کے بعد قائم نہ رہ سکی، اسی روز ایک بہت ہی سلجھے اور دور اندیش بنگالی مسلمان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا، تو وہ بھی کہنے لگے، ہمارے سامنے قومی سیرت و ذہن کا جو اعلیٰ تصور ہونا چاہیے، وہ ابھی تک نہیں پیدا کیا جا سکا ہے، یہ اعلیٰ تصور کسی مثالی نمونہ کے کردار رکھنے والے رہنما ہی کے ذریعہ ساری قوم کے سامنے آسکتا ہے، لیکن اس وقت ہماری ذہنی نشو ونما اخباروں کی لمبی لمبی سرخیوں اور جلسے جلوس کے نعروں سے ہو رہی ہے، وہ یہ بھی کہنے لگے کہ اس وقت ہم صرف دنیاوی منفعت اور مادی فوائد کے حصول میں لگے ہوئے ہیں، فیکٹریوں، کارخانوں، محکموں اور عمارتوں کی توسیع کا مطالبہ تو جاری ہے، مگر کسی کو ذاتی اخلاق و سیرت کو سنوارنے کے لیے کچھ کہیے تو وہ سننے کے لیے تیار نہیں، یہ مادی فوائد کی ہوس معلوم نہیں ہم کو کہاں لے جائے گی۔

بہت سے تعلیم یافتہ بنگالیوں سے ملنے کا موقع ملا جن میں ایک ریٹائرڈ ایس، پی تھے، کچھ سکریٹریٹ کے ملازمین اور کچھ ہائی کورٹ کے وکلا تھے، ان کی گفتگو کا رنگ کچھ اور تھا، ان سب کو شکایت تھی کہ مغربی پاکستان والوں نے انکے ساتھ بڑی بے انصافی کی ہے، بلکہ ظلم کیا ہے، ان کا خون چوس چوس کر اپنے یہاں غیر معمولی ترقی کر لی ہے، مشرقی پاکستان



زرمبادلہ زیادہ حاصل کرتا ہے لیکن ان کی ساری آمدنی کا نوے فی صد حصہ مغربی پاکستان میں خرچ ہوتا رہتا ہے، کراچی اور اسلام آباد کی ترقی ان ہی کے روپے سے ہوئی ہے، ملازمتوں میں ان کی آبادی کے تناسب کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے، فوج میں ان کو جگہ نہیں دی جاتی، انگریزوں کے زمانے کی طرح وہ مغربی پاکستان کے محض محکوم ہیں، یہ کیسی بے انصافی ہے کہ ان کی آبادی تو اکثریت میں ہے، لیکن اکثریت اقلیت کے ماتحت ہو گئی ہے، انصاف کا تقاضا ہے کہ اکثریت کی حکومت ہونی چاہیے، اس لیے سارے مرکزی دفاتر حتی کہ دار السلطنت کو بھی مشرقی پاکستان ہی میں رہنا چاہیے، ان کی شکایتوں میں بڑی تلخی ہوتی تھی، اتفاق سے ان ہی دنوں لاہور کے ایک ہفتہ وار رسالہ "زندگی" کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، اسکے سرورق پر یہ لکھا ہوا تھا کہ اس کی اشاعت ۴۲ ہزار ہے، اس کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی، مدیر مسئول الطاف حسین قریشی اور مدیر مجیب الرحمن شامی ہیں، اس میں ایک ایسا مضمون نظر سے گزرا جس میں مشرقی پاکستان کی بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اس کی تردید کی گئی تھی کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کے مقابلہ میں سال زرمبادلہ زیادہ حاصل کرتا ہے، مثلاً اس میں ۱۹۶۳-۶۴ء تک کے برآمد کے اعداد و شمار دیے گئے تھے، اس کے بیان کے مطابق ۱۹۶۳-۶۴ء میں مشرقی پاکستان سے ایک ارب ۲۲ کروڑ اور مغربی پاکستان سے ایک ارب ۷ کروڑ کی برآمد ہوئی لیکن مغربی پاکستان کی برآمد کی کمی کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ یہ اپنا مال باہر بھیجنے کے بجائے مشرقی پاکستان کو بھی سپلائی کرتا ہے، مثلاً ۱۹۶۳-۶۴ء میں مشرقی پاکستان نے مغربی پاکستان کو ۴۰ کروڑ ۹۱ لاکھ کا مال بھیجا تو مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کو ۵۸ کروڑ ۱۵ لاکھ کا مال بھیجا، درآمد میں بھی مغربی پاکستان مشرقی پاکستان سے بڑھا ہوا ہے، مثلاً ۱۹۶۳-۶۴ء میں مشرقی پاکستان نے ایک ارب ۴۵ کروڑ کا مال درآمد کیا تو مغربی پاکستان نے ۲ ارب ۹۸ کروڑ کا مال درآمد کیا، پھر اس مضمون میں

یہ بھی تھا کہ مرکزی حکومت زرمبادلہ مشرقی پاکستان میں زیادہ خرچ کر رہی ہے، مثلاً ۶۵-۱۹۶۴ء میں
یہ زرمبادلہ مشرقی پاکستان میں ۳۹ کروڑ ۲۰ لاکھ خرچ ہوئے، اس کے مقابلہ میں مغربی پاکستان میں
صرف ۲۷ کروڑ ۹۱ لاکھ خرچ کیے گئے۔ میں نے ایک ذی ایک سنجیدہ بنگالی مسلمان سے اس مضمون کے اعداد و شمار
کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگے کہ یہ قابل اعتماد نہیں، یہ محض اخباری پروپیگنڈا ہے، پھر یہ بھی کہا کہ ہمارا بیرونی زرمبادلہ
اب تو ہر سال کم ہوتا جائے گا، اس لیے کہ مغربی پاکستان تیزی سے ہر شعبہ میں ترقی کر رہا ہے، اور ہم بہت
پچھڑتے جا رہے ہیں، تعلیم یافتہ مہاجروں کا بھی خیال تھا کہ ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان میں پہلے سے ضرور
زیادہ ترقی ہوئی ہے، پھر بھی مرکزی حکومت نے بہت سی باتوں میں اس علاقہ کو کافی نظر انداز کیا ہے،
جس سے مشرقی پاکستان والوں کا اشتعال بڑی حد تک درست ہے۔ مگر مرکزی حکومت کے ایک
بہت بڑے افسر سے بات ہوئی تو وہ یہ کہتے تھے کہ مشرقی پاکستان میں ترقیاتی پروگرام کے لیے جو روپئے
مرکز سے آتے ہیں وہ اس عجلت اور مستعدی سے خرچ نہیں کیے جاتے جس طرح پاکستان کے مغربی حصہ میں
ہوتے ہیں۔

ان گفتگوؤں کو سن کر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر غلط فہمیاں دور ہوتی رہیں تو پھر بہت سی تلخیاں
خود بخود رفع ہو جائیں، پاکستان مسلمانوں کی بڑی قربانیوں کے بعد بنا ہے، ۱۸۵۷ء کے بعد ان کو پھر سے
ایک مملکت ملی ہے، جس پر ان کو حکومت کرنے کا موقع ملا ہے، ان کی سلطنت ایک زمانہ میں کشمیر سے
اراکان تک پھیل گئی تھی لیکن وہ کھو بیٹھے، آخر ان کے زوال کے کیا اسباب ہوئے، حال اور مستقبل کو
سنوارنے کے لیے ماضی سے بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، مسلمان ۱۲۰۶ء سے ۱۸۵۷ء تک ہندوستان
کے اندر قطب مینار، تخت طاؤس اور تاج محل تو ضرور بناتے رہے، لیکن انھوں نے کوئی ایسا مضبوط
صالح، توانا اور صحت مند معاشرہ نہیں بنایا جو ان کو ہر حال میں سنوارے اور سنبھالے رکھتا، اسی لیے
وہ منتشر اور پراگندہ ہو کر سب کچھ کھو بیٹھے، ماضی کے اس دردناک پہلو سے بہت کچھ سبق حاصل کیا جا سکتا ہے،



تاریخ کہتی ہے کہ معاشرہ اچھا ہوتا ہے تو سیاست بھی اچھی رہتی ہے، معاشرہ بگڑا ہوا ہو تو سیاست
بھی بگڑی رہتی ہے، ارباب فکر کی تعلیم ہے کہ اچھے معاشرہ کے لیے پاک ضمیر، بلند خیال اور
لطیف ذوق کا ہونا ضروری ہے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب قوم کی اصلی روح میں پاکیزگی
بھی ہو، اقبال نے بھی کہا ہے ؎

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

اس مرتبہ ڈھاکہ یونیورسٹی نہ جا سکا، کیونکہ یہ بند تھی، لیکن ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی صدر
شعبۂ اردو، اور ڈاکٹر ظفر الہدیٰ ریڈر شعبۂ فارسی سے جا کر ملا، ان سے معلوم ہوا کہ یونیورسٹی میں
فارسی میں طلبہ کی تعداد برائے نام رہ گئی ہے، اردو میں بھی ان کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے،
عربی میں بھی تعداد کچھ اچھی نہیں ہے، اور دوسری جگہوں کی طرح یہاں کے بھی طلبہ سیاسی
پارٹیوں کے ساتھ ہو جاتے ہیں، اخباروں سے معلوم ہوا کہ یہاں کے طلبہ دو گروہوں میں تقسیم
ہیں، سیکولرسٹ اور اسلام پسند، ان دونوں گروہوں میں ایک سال پہلے سخت تصادم ہو گیا
تھا جس میں ایک طالب علم عبدالمالک شہید ہو گیا، وہ اسلام پسند طلبہ کا رہنما تھا، میرے قیام کے
زمانہ میں اخباروں میں یہ خبر چھپی کہ ۲۵ راکتوبر کی رات کو اس جگہ جہاں عبدالمالک کی موت ہوئی
ہزاروں طالب علم جوان، بوڑھے اور عام شہری کلمۂ توحید اور کلمۂ شہادت کا ورد اور
حفاظ کلام پاک کی تلاوت کر رہے تھے، عبدالمالک کی یاد میں ریس کورس میں ایک مسجد تعمیر کرنے
کی بھی تجویز منظور ہوئی، اسلام پسند طلبہ کے ان جذبات کے باوجود یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کے اثرات سے
سیکولرسٹ طلبہ کا جوش و خروش مدھم پڑ جائے گا، ان کی سیکولرزم پر بنگالی نیشنلزم زیادہ غالب
ہے جو پاکستانی نیشنلزم سے زیادہ ہم آہنگ نہیں،

ایک روز پاکستان ایشیاٹک سوسائٹی میں بھی گیا، اس کے لائبریرین جناب ضیا دائروی عثمانی نے

اس کی ہر چیز بہت شوق سے دکھائی، یہ ۱۹۵۱ء میں قائم ہوئی، مگر ابتک کرایہ کی عمارت میں ہے، اس کا کتب خانہ بھی بہت بڑا نہیں ہے، لیکن اس انیس ۱۹ برس کے اندر اس کی طرف سے بہت سی مفید کتابیں شائع ہوئی ہیں، جو زیادہ تر انگریزی میں ہیں، یہ ایک شیلف میں رکھی ہوئی تھیں، ان میں ڈاکٹر اے ایچ۔ دانی کی دو کتابیں "بنگال میں مسلمانوں کے عہد کی تاریخی عمارتیں" اور "بنگال میں مسلم کتبات کی کتابیات" تھیں، وہ اس وقت پشاور یونیورسٹی میں ارکیالوجی کے شعبہ کے صدر ہیں، اور پاکستان کی قدیم تاریخ اور انڈولوجی کے بہت بڑے ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں، مطبوعات کے اس سلسلہ میں ڈاکٹر ابو امام کی کتاب "سر الکزنڈر کننگھم اور ہندوستان کے آثار قدیمہ" بھی تھی، میجر جنرل الکزنڈر کننگھم (۱۸۱۴ء - ۱۸۹۳ء) ہندوستان و پاکستان میں ایک بڑے محسن کی حیثیت سے یاد کیے جائیں گے، انھوں نے ہندوستان کے ارکیالوجیکل سروے کے ڈائرکٹر جنرل کی حیثیت سے اپنی رپورٹ کی تقریباً ۲۳ جلدیں مرتب کی تھیں جن میں ہندوستان کے شمالی اور وسطی حصوں کے آثار قدیمہ سے متعلق بڑے قیمتی تاریخی اور اثری معلومات ہیں، ابو امام صاحب نے انکے کارناموں کو اپنی کتاب میں پیش کر کے اس محسن کا جو حق تھا وہ پورا کر دیا ہے، اس سلسلہ کی اہم مطبوعات میں تاریخ خاں جہانی و مخزن افغانی کی دو جلدیں بھی ہیں، جن کو ڈاکٹر ایس۔ ایم امام الدین ریڈر اسلامک ہسٹری اینڈ کلچر ڈھاکہ یونیورسٹی نے بڑی محنت سے ایڈٹ کیا ہے، اور اپنے فاضلانہ مقدمہ میں اس غلط فہمی کو دور کیا ہے کہ تاریخ خاں جہانی اور مخزن افغانی دونوں ایک ہی کتاب ہیں، مخزن افغانی تاریخ خان جہانی کا خلاصہ ہے، موخر الذکر تاریخ کا مصنف نعمت اللہ ہے، اس نے یہ تاریخ ۱۰ ذی الحجہ ۱۰۲۱ھ مطابق ۲۲ جنوری ۱۶۱۳ء میں ختم کی اور اپنے مربی خان جہاں کے نام پر اس کا نام رکھا، اس میں ہندوستان کے افغان حکمرانوں کی تاریخ لودی سلاطین سے سوری خاندان کے خاتمہ تک کی ہے، یہ جہانگیر کے عہد میں لکھی گئی، اس لیے اس کے ابتدائی دور کی بھی



کچھ تاریخ ضمناً آگئی ہے۔

سوسائٹی کی مطبوعات کی اشاعت سے پاکستان کے نئے اور ہونہار اہل قلم کی تحقیقی صلاحیتیں بھی بروئے کار آرہی ہیں، ان ہی میں ڈاکٹر عبد الکریم ہیں، جن کی حسب ذیل چار کتابیں اس سلسلہ میں دیکھیں، "بنگال میں مسلمانوں کی معاشرتی تاریخ"، "بنگال کے مسلمان حکمرانوں کے سکے"، "مرشد علی خاں اور اس کا عہد"، "مغلوں کے عہد میں ڈھاکہ"، ان سے مشرقی پاکستان کے تاریخی لٹریچر میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے، امید ہے کہ ڈاکٹر عبد الکریم کی یہ علمی سرگرمیاں آئندہ بھی جاری رہیں گی، تاکہ وہ آگے چل کر پاکستان کے ایک مایۂ ناز مورخ کی حیثیت سے یاد کیے جائیں۔ بنگال پر جو اور دوسری تاریخی کتابیں یہاں سے شائع ہوئی ہیں، ان کے نام یہ ہیں: "وہابی تحریک کے خلاف مقدمات کے سلسلہ میں حکومت بنگال کے دستاویزات کے انتخابات" از ڈاکٹر معین الدین احمد خاں، کراچی یونیورسٹی "حسین شاہی بنگال" از ڈاکٹر ممتاز الرحمٰن طرفدار، ڈھاکہ یونیورسٹی "ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں بنگال کی تجارتی اور بحری پالیسی" از ڈاکٹر مظہر الحق۔ "برٹش پالیسی اور بنگال کے مسلمان" از ڈاکٹر اے۔ آر ملک اس آخری کتاب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انگریزوں نے اٹھارہویں صدی کے آخر سے مسلمانوں کے خلاف جو سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی پالیسی اختیار کی، اسی کے نتیجہ میں برصغیر ہند کی تقسیم ہوئی۔

سوسائٹی کی طرف سے عمرانیات پر بھی تین کتابیں شائع ہوئی ہیں، پادرے بے سنگنٹ، یونسکو کی طرف سے ڈھاکہ میں عمرانیات کے پروفیسر تھے، انھوں نے یہاں رہ کر چاٹگام کے پہاڑی قبیلوں کا مطالعہ کیا، اور ایک کتاب "چاٹگام کے پہاڑی علاقے کے قبیلے" کے نام سے لکھی، انھوں نے ایک دوسری کتاب "مشرقی پاکستان میں سوشل ریسرچ" کے نام سے مرتب کی ہے جس میں مشرقی پاکستان کے عمرانی مسائل پر بہت سے ممتاز اہل قلم کے مضامین ہیں، ان کے علاوہ ڈاکٹر جے۔ ای اوون نے بھی "مشرقی پاکستان میں عمرانیات" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے۔

سوسائٹی کی اور دوسری مطبوعات یہ ہیں "بنو امیہ کے عہد میں اسپین کی اقتصادی تاریخ" از ڈاکٹر ایس، ایم امام الدین۔ "بنگالی زبان کے مخطوطات کی فہرست" مرتبہ منشی عبدالکریم و احمد شریف۔ "ڈھاکہ کی مچھلیاں" از عبداللطیف۔ "پاکستان میں انتخابی مسائل" از ڈاکٹر محفوظ الحق۔ "ہندوستان اور پاکستان میں مسلم اسلامی تحریکات کی کتابیات" از ڈاکٹر محی الدین احمد خاں۔ "ڈاکٹر محمد شہید اللہ کی یادگار جلد" مرتبہ ڈاکٹر انعام الحق۔ انیس برس کی مدت میں مذکورہ بالا معیاری کتابوں کی اشاعت ضرور قابل قدر ہے، دارالمصنفین کیلئے یہ کتابیں ہدیے کے طور پر مجھکو دی جارہی تھیں، لیکن ان کا لانا آسان کام نہ تھا، سوسائٹی کی طرف سے ایک رسالہ بھی ہر چار مہینہ کے بعد جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف پاکستان کے نام سے شائع ہوتا ہے، کلکتہ کی بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے علمی کارنامے تو بہت شاندار ہیں، ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد میں جو اہم فارسی تاریخیں لکھی گئی تھیں، ان میں بہت سی کتابیں اس کی طرف سے شائع ہوئی ہیں، اور یہ ایسا احسان ہے جو مسلمانوں کے عہد سے دلچسپی رکھنے والے مورخین فراموش نہیں کرسکتے، پاکستان کی ایشیاٹک سوسائٹی کو بھی اُن فارسی تاریخوں کی اشاعت کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے، جو اب تک شائع نہیں ہوسکی ہیں، تاکہ اس کا کارنامہ اس لحاظ سے بھی قابل قدر سمجھا جائے۔

اسی اثنا میں مولانا جمال میاں مکہ معظمہ سے ڈھاکہ واپس آگئے، ان کی کوٹھی پر حاضر ہوا، تو بڑی محبت سے پیش آئے، ۱۹۶۵ء میں ان سے فرنگی محل میں ملا تھا، تو اس وقت وہ مجھکو بہت شکیل و جمیل نظر آئے تھے، وہ باتیں کرتے تو ان کے منہ سے پھول جھڑتے تھے، ہر بات پر ایک موزوں شعر پڑھ دیتے، لیکن اس عرصہ میں ان کی صحت اچھی نہیں رہی، اس لیے ان کے چہرہ پر پہلی سی شگفتگی اور شادابی نہیں تھی، گو انھوں نے انگلستان جاکر اپنا علاج بھی کرایا ہے، ڈھاکہ میں رہ کر بھی خاندانی مہمانداری اور وضعداری میں فرنگی محل لکھنؤ اور اپنے والد بزرگوار جناب مولانا عبدالباری صاحبؒ کی شاندار روایت کو برقرار رکھا ہے، کئی ملاقاتوں میں دارالمصنفین کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی، دارالمصنفین کی مطبوعات پر دستبرد کو



روکنے کے لیے انھوں نے مختلف قسم کے مشورے دیے، ان مشوروں کو عملی شکل دینے میں ان کو بھی یہ خیال رہا کہ جب تک دونوں ملکوں کے تعلقات خراب ہیں، دارالمصنفین کے لیے پاکستان میں کوئی ایسا کام نہیں ہونا چاہیے جس سے یہ علمی ادارہ ہندوستان کی حکومت اور وہاں کے لوگوں کی نظر میں مجروح اور مشکوک ہو جائے، کیونکہ ان کو یہ اچھی طرح علم تھا کہ دارالمصنفین اگر پاکستان کے علمی اور سنجیدہ حلقہ میں اچھی نظر سے دیکھا جاتا ہے تو ہندوستان میں بھی سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں پسند کیا جاتا ہے، اس ادارہ کی اس خصوصیت کو ہر حال میں برقرار رکھنا ہے، لیکن ہم دونوں اس سے متفق تھے کہ کوئی ایسی موثر صورت اختیار کی جانی چاہیے جس سے دارالمصنفین کی مطبوعات پاکستان کے ناشر اجازت کے بغیر چھاپنے نہ پائیں، انھوں نے کراچی کے کچھ لوگوں کے نام بتائے جو اس سلسلہ میں زیادہ عملی مشورے دے سکتے تھے۔

ڈھاکہ میں فساد کی وجہ سے ڈھاکہ اور کراچی کے ہوائی جہاز کے مسافروں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی، اس لیے کراچی کے لیے ٹکٹ حاصل کرنا آسان کام نہ تھا، ۱۴ر نومبر کو مجھکو کراچی کے لیے ٹکٹ ملا، میرے ہم سفر میرے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر سید محمد شمیم بھی ہوئے، جو ڈھاکہ کے بہت کامیاب اور ہر دلعزیز ڈاکٹر ہیں، ان کی وجہ سے ہوائی جہاز کا سفر بہت خوشگوار رہا، ڈھاکہ سے ہم لوگ سات بجے شام کو چلے تھے اور سوا تین گھنٹے میں کراچی پہنچ گئے، ہم دونوں کا قیام اپنے ایک سعادتمند عزیز خالد شرف الدین سلمہ کے یہاں ہوا، جو پاکستان کے اسٹیٹ بینک میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہیں، ان کا کوارٹر اسٹیٹ بینک افیسر کالونی میں واقع ہے جو بڑا آرام دہ تھا، پھر انھوں نے اپنی سعادتمندی سے ہر طرح کی راحت پہنچائی، اس سے پہلے میں کراچی ۱۹۵۵ء میں آیا تھا، اس پندرہ برس میں کراچی میں ہر طرف بڑی توسیع ہوگئی ہے، ہر ایک کالونی ایک شہر ہے، مثلاً پاکستان ایمپلائز ہاؤسنگ سوسائٹی گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی آبادی سوا لاکھ ہے،

کراچی آکر سب سے پہلے استاذی المحترم علامہ سید سلیمان ندویؒ کے مزار پر حاضری دی، پہلے یہ مزار ایک کھلے ہوئے میدان میں تھا، اسکے تھوڑے فاصلہ پر مولانا شبیر احمد عثمانی کا مرقد تھا، اب اس میدان میں اسلامیہ کالج کی عمارت بن گئی ہے، حضرت سید صاحب کے داماد سید محی الدین مرحوم نے اس کو علٰحدہ کر کے گھیر دیا ہے، پورا مزار اب سنگ مرمر کا ہے، فاتحہ پڑھتے وقت آنکھوں سے آنسو جاری تھا کہ اسکے نیچے کون ہے؛ شمع رسالت کا پروانہ، جوئے شیر اسلامیہ کا فرہاد، علم و فن کا مجسمہ، اخلاق، اخلاص، محبت، شفقت، لینت نرمی کا پیکر، تحمل، بردباری، توکل اور قناعت کا ستون، آنکھیں بند تھیں اور دیکھ رہا تھا کہ وہ دارالمصنفین کے کتب خانہ میں اپنی میز پر بیٹھے لکھ رہے ہیں، وہ اس کے احاطہ میں چل رہے ہیں، پھر رہے ہیں، آرہے ہیں، جارہے ہیں، مسکرا رہے ہیں، اپنے شاگردوں کو علمی نکتے بتا رہے ہیں تحقیق و تلاش کے راز آشکارا کر رہے ہیں، اپنی ایک بات سے علم و ادب کی تمام گتھیاں سلجھا رہے ہیں، میرا جی چاہا کہ قبر سے لپٹ جاؤں، ان کے سارے احسانات آنکھوں کے سامنے آگئے، خیال آیا کہ انکی آخری آرامگاہ دارالمصنفین ہی میں ہونا چاہیے تھا جس کو انھوں نے اپنے خون اور پسینہ سے سینچا، وہی ان کا تخت طاؤس رہا، وہی انکا تاج محل بھی ہونا چاہیے تھا، مگر آہ! مصلحت خداوندی اور مشیت ایزدی کچھ اور تھی، دارالمصنفین میں وہ ابدی نیند سوتے ہوتے تو ہر لمحہ ان کے شاگرد اپنی عقیدت کے نذرانے انکے مرقد مبارک پر چڑھاتے اور اسکی خاک کو طوطیائے چشم بناتے رہتے، اور وہ اندر سے ژرف نگاہی، نکتہ پروری اور فکری گہرائی کی کرنیں پھوٹتے ہوئے دیکھتے، آہ! وہ کراچی میں اس وقت اجنبی بنے ہوئے ہیں لیکن دارالمصنفین کے احاطہ میں اپنی وفات کے بعد بھی وہ اپنے شاگردوں کے جھرمٹ میں پاتے، میں زبان حال سے کہہ رہا تھا، استاد محترم! آپ اب بھی ہم لوگوں کے ذہن و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں، آپ کا قلم تو ہم لوگ نہ پاسکے لیکن آپکے قلم کے صریر کی صدائیں کانوں میں گونج رہی ہیں اور اسی کی رجزخوانی اور حدی خوانی کے سہارے ہمارا قافلہ چلتا ہوا نظر آتا ہے۔ سلام، ہزاروں سلام، لاکھوں سلام۔

پھر بیگم صاحبہ (یعنی اہلیہ استاذی المحترم) کی خدمت میں حاضر ہوا، جو اس طرح ملیں جس طرح کوئی ماں اپنے فرزند سے ملتی ہو۔

(باقی)



# حیاتی گیلانی، حیاتی کاشی اور تغلق نامۂ امیر خسرو

از جناب ڈاکٹر امیر حسن صاحب عابدی صدر شعبۂ عربی و فارسی دہلی یونیورسٹی

مولانا حیاتی گیلانی گیلان کے شہر رست میں پیدا ہوئے اور سن رشد کو پہنچکر بحیثیت تاجر کاشان اور گیلان کے درمیان آتے جاتے رہے، عراق اور خراسان کی بھی سیر کی شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں وہ ہندوستان آئے اور حکیم ابوالفتح گیلانی کے توسط سے اکبر کے ملازم اور صاحب ثروت و منصب ہوئے۔ اکبر کے بعد جہانگیر کے مداحوں میں ہو گئے، اور ہمیشہ بادشاہ کے ساتھ رہتے تھے، آخر میں حیاتی عبد الرحیم خانخانان سے بھی متوسل ہوئے۔ انکے سال وفات میں اختلاف ہے، مگر سعید گیلانی کے ایک قطعہ سے جو ان کے سونے چاندی میں تولنے پر کہا تھا ۱۰۱۹ھ نکلتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس وقت تک زندہ تھے،

حیاتی کاشی شروع میں سقائی کا کام کرتے تھے، کہا جاتا ہے کہ نقطوی خیالات کی وجہ سے بادشاہ وقت نے ان کو قید میں ڈال دیا تھا، دو سال کے بعد جب قید سے چھوٹے تو شیراز چلے گئے، اور وہاں سے کاشان پہنچے، اس کے بعد قزوین پہنچے اور وہاں سے ہندوستان آئے، اور احمد نگر میں رہنے لگے، اور ۱۰۱۱ھ میں انتقال کیا،

حضرت امیر خسرو کی آخری تصنیف تغلق نامہ ہے، جسے انھوں نے تغلق حکومت کے بانی سلطان غیاث الدین تغلق کی فرمائش پر لکھا تھا، جہانگیر کے زمانہ میں اس مثنوی کا صرف ایک نسخہ موجود تھا جس کے دونوں طرف ناقص تھے، اس لیے بادشاہ نے اپنے

درباریوں کو حکم دیا کہ اس کو مکمل کر دیں، حیاتی کا تکمیل کردہ تغلق نامہ بادشاہ کو اس قدر پسند آیا کہ اس کو سونے چاندی میں تلوایا۔

مجلس مخطوطات فارسی حیدرآباد دکن نے ۱۳۵۲ھ میں حیاتی کے الحاقی تغلق نامہ کو شائع کیا، ابھی حال میں مجھے دیوان حیاتی کا ایک قلمی نسخہ ملا ہے جو الہ آباد میوزیم (۱۶۸۰) میں ہے، اس میں تغلق نامہ بھی ہے، اور یہ تغلق نامہ مطبوعہ تغلق نامہ سے بہت کچھ مختلف ہے، خاص کر مثنوی کا آخری حصہ، مطبوعہ تغلق نامہ کے اڈیٹر ہاشمی فرید آبادی صاحب نے الحاقی تغلق نامہ کو حیاتی کاشی کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن میری رائے میں یہ حیاتی گیلانی کا ہے، یہ دونوں شاعر بالکل معاصر تو نہ تھے، لیکن ان کا زمانہ ایک دوسرے سے بالکل قریب تھا،

یہ بحث کہ مثنوی حیاتی گیلانی کی ہے، یا حیاتی کاشی کی، اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنا یہ امر کہ اصل مطلب دونوں مثنویوں میں مختلف ہے، جس سے اس زمانہ کی تاریخ کے مطالعہ کرنے والوں کے نظریات میں فرق ہو سکتا ہے۔

---





# مکتوبات ایران

کتاب خانہ پہلوی - خیابان شاہ رضا

تہران - ۱۳ رمضان المبارک

جناب مدیر محترم دارالمصنفین صاحب سلام علیکم و رحمۃ اللہ

میں تہران یونیورسٹی میں "معارف اسلامی در ہند و پاکستان" کی کلاسیں لیتا ہوں، اس کے علاوہ وزارت دربار شاہنشاہی ایران سے متعلق ایک ادارے ایران شناسان کے جہانی مرکز میں ہند و پاک کے شعبہ کا متصدی ہوں، اپنی تدریسی اور ادارتی ضروریات کے پیش نظر ہندوستان کے ان تمام موسسات کے بارے میں اطلاعات جمع کر رہا ہوں جنھوں نے مسلمانان ہندوستان اور فارسی کے سلسلے میں اہم خدمات علمی انجام دی ہیں، ادارہ دارالمصنفین کی اہمیت اور عظمت اظہر من الشمس ہے، چنانچہ آپ سے التجا ہے براہ مہربانی اس ادارہ سے متعلق اطلاعات عنایت فرما کر شکر گذاری کا موقع دیجئے۔

اس ادارے کی تشکیل اور علمی و ادبی خدمات کا تعارف درکار ہے، جسے یہاں کے اہم علمی رسالوں اور اپنی کتاب کے لیے حاصل کرنا چاہتا ہوں، امید ہے آپ جلد ہی میری استدعا کو قبول فرماتے ہوئے دارالمصنفین سے مجھے کماحقہ روشناس کرائیں گے۔

میرے پاس بزم تیموریہ اور بزم مملوکیہ موجود ہیں۔ کیا خلجیوں، تغلقوں اور لودیوں کے زمانے سے متعلق بھی بزم خلجیہ و بزم تغلقیہ و بزم لودیہ کتابیں چھپ چکی ہیں؟ دارالمصنفین

کی مطبوعات منگانے کے سلسلے میں کس طرح اقدام کیا جا سکتا ہے؟ واقعاً آپ کا ادارہ بڑی سنجیدہ اور ٹھوس قسم کی علمی خدمات انجام دے رہا ہے، بزم مملوکیہ اور بزم تیموریہ بڑی قابل قدر مطبوعات ہیں، سبحان اللہ بہت ہی اچھا کام کیا گیا ہے۔

عید الفطر کی مبارک باد قبول فرمایئے۔ آپ کے جملہ ہمکاروں اور مددگاروں کو مخلصانہ سلام۔

والسلام

ارادت مند، دکتر شہریار نقوی

(۲)

کتاب خانہ پہلوی

سرور گرامی دانشمند عالی مقام فاضل ارجمند و ذی کرام

سلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا نوازش نامہ مورخہ ۱۰؍ دسمبر موصول اور منکشف حالات ہوا، ذرہ نوازی کا بے انتہا شکریہ، آپ کے حسب ارشاد میں نے تہران یونیورسٹی سے چاہا کہ آپ کو پچاس کتابیں فوراً بھیج دی جائیں چنانچہ انھوں نے مجھے اطلاع دی کہ کتابیں بھیجی جا رہی ہیں، کتابوں کی روانگی کی اطلاع دالی چٹھی ۲؍ جنوری ۱۹۵۰ء کو لکھی گئی ہے، ارسال شدہ کتابوں کی فہرست کی ایک نقل لفوف کی جا رہی ہے۔ کتابوں کے پہنچ جانے پر ضرور مطلع فرمائیں۔

میں ایران اور تہران یونیورسٹی میں برصغیر کے مسلمانوں سے متعلق تمام امور کا جاننے والا سمجھا جاتا ہوں، میری کلاسیں بھی "معارف اسلامی در ہند و پاکستان" کے عنوان سے قائم ہیں، یہاں کے رسالوں، اخباروں اور ریڈیو میں بھی میرے مقالات اور لیکچر ان ہی عناوین کے تحت چھپتے اور براڈکاسٹ ہوتے رہتے ہیں، اسی لیے اشد ضرورت مجھے اس کی ہے کہ میرے گھر میں اردو



کی مکمل لائبریری ہو، اور مجھے ہندوستان و پاکستان والے رسالوں اور اپنی مطبوعات کے ذریعہ وہاں کے جملہ امور ثقافتی، ادبی اور تاریخی سے مطلع رکھیں، میں ایرانی ہوں لیکن یوپی کی فضاؤں کا پروردہ، مجھے اعظم گڈھ، بلگرام، علی گڑھ اور یوپی کے تمام علمی مراکز سے بے انتہا محبت ہے، بھوپال، حیدر آباد دکن، لکھنو، جونپور، جے پور، کلکتہ، بمبئی، دہلی اور ہندوستان کے متعدد علمی اور اسلامی مراکز میں رہا ہوں، اسی لیے وہاں کے زعمائے قوم اور علمی اور ادبی رہنماؤں سے بخوبی آشنا ہوں، میری تمنا ہے کہ یہاں بیٹھ کر وہاں کی علمی و ادبی شخصیتوں اور ثقافتی اور علمی اداروں کو فارسی دانوں سے روشناس کراؤں اور برصغیر کے مشاہیر علم و ادب کے کارناموں کو ایران میں متعارف کرا سکوں۔

آپ نے دار المصنفین کے تعارف کے لیے انگریزی اور اردو میں دو کتابچے اور دار المصنفین کی مطبوعات کی فہرست روانہ فرمانے کی اطلاع دی لیکن بدقسمتی سے باوجود شدید انتظار کے مجھے کوئی چیز بھی ہنوز موصول نہ ہو سکی، میں آج بھی بدستور آپ کی فرستادہ اطلاعات کا منتظر ہوں، امید ہے مجھے یہ کتابچے اور فہرست مطبوعات مل سکیں گی۔

کیا یہ ممکن ہے دار المصنفین کا مشہور رسالہ المعارف مجھے میسر آسکے، میں اس کے قدیم (قابل حصول) پرچے بھی حاصل کرنے کا آرزو مند ہوں۔ اس کا دائمی خریدار بننا چاہتا ہوں، جو صورت بھی ارسال زر کی آپ ارشاد فرمائیں تعمیل کروں گا، آپ کی ارسال شدہ فہرست کتب اور کتابچوں کے انتظار کے باعث جواب میں تاخیر ہوئی۔

خدا کرے آپ مع متعلقین بخیر و عافیت ہوں، اور جلد ہی جواب سے شاد کام فرمائیں۔

والسلام

آپ کا مخلص ارادتمند: دکتر شہریار نقوی

(۳)

کتابخانہ پہلوی، خیابان شاہ رضا

تہران - ۷ مارچ ۸۰ء

مکرمی محترمی جناب معین الدین صاحب سلام علیکم و رحمۃ اللہ

نوازش نامہ صادر ہوا، چند کتابچے بھی رجسٹرڈ ڈاک سے موصول ہوئے، ان سے کافی معلومات حاصل ہوسکیں، جیسا کہ قبلاً عرض کرچکا ہوں، دل میں یہ تمنا لیے ہوئے ہوں کہ ہندوستان کے مشاہیر اسلامی خاص طور پر ۱۸۵۷ء کے بعد کے علما، فضلا اور ادبا کو یہاں پہنچواؤں اور ان کے کارہائے نمایاں سے ایرانیوں کو مطلع کروں، ساتھ ہی اسلامی علوم کے اداروں کو بھی بیان کروں، ایسے اداروں میں دارالمصنفین کا خاص مقام ہے، اچھا ہوا اور بہت اچھا ہوا اس کی شناسائی میں آپ نے مدد فرمائی، آپ سے التجا ہے کہ ہندوستان کے دیگر علمی اور ثقافتی اداروں کے نام اور پتے بھی بتلادیں تاکہ ان سے بھی مراسلت کرسکوں، فارسی زبان میں ان اداروں اور مشاہیر کا تعارف میرے خیال سے ایک علمی خدمت ہوگی، ندوۃ العلماء کے بارے میں تو آپ بھی کافی اطلاعات فراہم فرما سکتے ہیں، جامعہ ملیہ کو لکھوں گا، اس قسم کے اور کون کون سے ادارے ایسے ہیں جن کی طرف توجہ کی جائے، ازراہ کرم اس کا جواب ضرور عنایت فرمائیں۔

آپ کی شرح حال کی بھی ضرورت ہے، اسی طرح دارالمصنفین سے منسلک جملہ دیگر اشخاص اور افراد کی شرح احوال درکار ہے، آپ کے ادارے کی مطبوعات کس طرح منگائی جاسکتی ہیں، "خیام" تالیف سید سلیمان ندوی کی بڑی ضرورت اس لیے ہے کہ اس کو فارسی میں ترجمہ کرنے کی نیت رکھتا ہوں، بزم تیموریہ کا فارسی ترجمہ ایک ہاشمی نام طالب علم نے جو دہلی سے یہاں آئے تھے کیا ہے، وہ دہلی چلے گئے، دہلی یونیورسٹی کے فارسی شعبہ سے ان کا اتا پتا چلایا جاسکتا ہے، شعر العجم



اور شبلی کی بعض دیگر تالیفات کے بارے میں آپ کو بخوبی علم ہے کہ فخر داعی گیلانی مرحوم نے ان کا فارسی ترجمہ کیا جو یہاں شائع ہوچکا ہے۔ مجھے علاوہ خیام کے جن کتابوں کی فوری ضرورت ہے وہ یہ ہیں: (۱) بزم صوفیہ (۲) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے اور تمدنی کارنامے (۳) عربوں کی جہازرانی (۴) ارمغان سلیمان (۵) اسلامی درسگاہیں (۶) معارف سلیمان نمبر۔ آپ جس طرح قبول فرمائیں ان کی قیمت ادا کی جائے گی۔ انکے برابر قیمت کی آپ کی پسندیدہ فارسی کتب بھی بھیجی جاسکتی ہیں۔

اسلامی درسگاہیں اور خیام یہ کتابیں بیحد ضروری اور انکی احتیاج فوری ہے۔

امید ہے ہندوستان کے مسلم علما اور ثقافتی اور علمی اداروں کا تعارف یہاں کراسکوں گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ، آپ ایسے ذی علم اور بے لوث مددگار مل جائیں تو اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانا دشوار نہیں۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔ والسلام

مخلص نیازمند

ڈاکٹر شہریار نقوی

---

# ادبیات

## غزل

از جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

دہشتِ خاک آج جو شکلِ بشر میں ہے
کل دیکھئے تو کارگہِ کوزہ گر میں ہے

گرمی کے ساتھ ساتھ چمک بھی شرر میں ہے
کتنا لطیف ربط یہاں خیر و شر میں ہے

سودائے عاشقی نہ فقط میرے سر میں ہے
عشق و جنون فطرتِ نوعِ بشر میں ہے

رعنائی تصورِ جاناں نہ پوچھئے
ہر لحظہ ایک عالمِ دیگر نظر میں ہے

حل کر سکے گا کیا وہ معمہ حیات کا
الجھا ہوا جو گردشِ شام و سحر میں ہے

ناآشنا ہے اس سے ابھی سینۂ ملک
وہ آگ جو چھپی ہوئی قلبِ بشر میں ہے

پاکیزگیٔ اشکِ ندامت نہ پوچھئے
موتی میں کب وہ آب ہے جو اس گہر میں ہے

دست طلب اٹھائے ہوئے ہیں خودی کی لاش
غیرت کا خون کاسۂ دریوزہ گر میں ہے

اے خضر اک عذابِ مسلسل ہے طولِ عمر
لطفِ حیات زندگیِ مختصر میں ہے

شاعر بھی محرمِ غمِ ہستی ہے اے حکیم
وہ درد میرے دل میں ہے جو تیرے سر میں ہے

پیتے ہیں اب بھی خونِ جگر صاحبانِ فن
اب بھی متاعِ عیش کفِ اہلِ زر میں ہے

اے بے خبر اسی کا تو ہے نام زندگی
پرواز کی خلش جو ترے بال و پر میں ہے

اے چشم ہوشیار نہ افشا ہو رازِ دل
اے دل ذرا قرار ابھی بات گھر میں ہے

ہنسنے کو چاہتا تو ہے میرا بھی دل ولی
لیکن مآلِ خندۂ گل بھی نظر میں ہے



## غزل

از جناب تسکین قریشی

تو ہین ذوقِ تشنہ لبی چاہتا نہیں
یہ بھی نہیں کہ پینے کو جی چاہتا نہیں

غم سے ہوں بے نیاز خوشی چاہتا نہیں
اتنا جیا کہ جینے کو جی چاہتا نہیں

ساقی شراب دے کہ نہ دے سب مجھے قبول
بس ایک تیری کم نگہی چاہتا نہیں

دل سے عزیز تر ہے مجھے دل کی عافیت
دل جس کو چاہتا ہے وہی چاہتا نہیں

ایسے بھی دوست ہم کو ملے ہیں کہ جن سے ہم
ملتے ہیں اور ملنے کو جی چاہتا نہیں

میرا مقام رندی و مستی کچھ اور ہے
میں سب کے ساتھ بادہ کشی چاہتا نہیں

ننگِ طلب ہے منزلِ گم گشتہ کی طلب
میں زندگی بھی گزری ہوئی چاہتا نہیں

واعظ یہ ایک بات نئی میکدے میں ہے
جب بیٹھیے تو اُٹھنے کو جی چاہتا نہیں

ہر تیر و نیشتر کی جگہ میرے دل میں ہے
احباب کی میں دل شکنی چاہتا نہیں

یہ دور ہے ستم کے لیے کتنا سازگار
مظلوم آج دادرسی چاہتا نہیں

ہر جدتِ کلام ہے تسکیں مجھے پسند
لیکن ادب کی بے ادبی چاہتا نہیں

---

# مطبوعاتِ جدیدہ

**مسلمانوں کے عقائد و افکار حصہ اوّل** | مترجمہ مولانا محمد حنیف صاحب ندوی متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۷۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت: للعہ، پتہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، پاکستان۔

امام اہلسنت والجماعت علامہ ابو الحسن اشعری تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے نامور علمائے متکلمین میں ہیں، ان کی تصنیفات کی تعداد ایک سنو سے متجاوز ہے، اُن میں "مقالات الاسلامیین" زیادہ مشہور اور علم کلام کی امہاتِ کتب میں شمار کی جاتی ہے، امام صاحب نے اس میں اپنے زمانہ تک کے اہم مسلمان فرقوں، شیعہ، خوارج، مرجئہ، معتزلہ جہمیہ، ضراریہ، بکریہ اور اصحاب حدیث یعنی اہل سُنّت والجماعت کے عقائد و آراء سے بحث کی ہے، اور ان فرقوں کے ذیلی فرقوں کا مفصل تذکرہ بھی کیا ہے، اس اعتبار سے فرق اسلامیہ کے موضوع پر یہ پہلی جامع اور مستند کتاب ہے، جس میں ہر فرقہ کے اصول اور بنیادی عقائد کا غیر جانبداری سے ذکر کیا گیا ہے جو اپنی اہمیت کی بنا پر اس موضوع پر بعد میں لکھی جانے والی تمام کتابوں کا ماخذ رہی ہے، اس کے دو ایڈیشن استنبول اور مصر سے دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں، اب ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے فاضل رکن مولانا محمد حنیف ندوی نے ان دونوں کو سامنے رکھکر جلد اول کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے، اس میں مصری اڈیشن کے اکثر حواشی کے ساتھ فاضل مترجم کے بعض نئے مفید حواشی بھی شامل ہیں،



شروع میں فاضل مترجم کے قلم سے اڑتالیس صفحے کا ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں امام اشعری کے حالات و مناقب اور تصنیفات کا مفصل ذکر اور اُن کے اعتزال سے الگ ہونے کے اسباب اور رجعت پسندی کے الزام کا خصوصیت سے جائزہ لیا گیا ہے، ترجمہ سلیس ہے، مگر انشاء پردازی کے زور کی بنا پر کہیں کہیں ناہمواری آگئی ہے، مقدمہ کے ص ۳۲ پر مسئلۂ صفات کے متعلق امام اشعری کے موقف میں التباس دکھانے کے بعد اپنا جو موقف تحریر کیا گیا ہے، وہ بھی واضح نہیں ہے، حواشی کے ص ۳۵۲ میں حماسہ کے اس شعر

اقول لها وقد طارت شعاعاً — من الابطال ویحك لن تراعی

کا یہ ترجمہ کیا گیا ہے "جب اس کا دل خوف سے پراگندہ ہوگیا، تو میں نے کہا پگلی! جنگ جو بہادروں کے معاملہ میں ڈر اور وہم کو دل سے نکال دے" اس میں کئی غلطیاں ہیں، "اُس کا دل" اور "میں نے کہا پگلی" سے ظاہر ہوتا ہے کہ مترجم نے شاعر کا مخاطب کسی عورت کو سمجھا ہے، حالانکہ مخاطب خود اُس کا نفس ہے، "من الابطال" کو معلوم نہیں کس کے متعلق قرار دیا گیا ہے، حالانکہ وہ "قد طارت شعاعاً" کے متعلق ہے، ویحک کا ترجمہ ہی نہیں کیا گیا ہے، اور "لن تراعی" کا ترجمہ وہم کے بجائے خوف کو دل سے نکال دے ہونا چاہئے، ان فرو گذاشتوں سے قطع نظر اس ترجمہ کی اشاعت سے ایک مفید علمی و کلامی کتاب کا اردو میں اضافہ ہوا ہے،

**مسلم پرسنل اور اسلام کا عائلی نظام۔** مرتبہ مولوی شمس تبریز خاں صاحب متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۶۳ مجلد مع گرد پوش، قیمت صر، پتہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

مسلم پرسنل لا پر بہت لکھا جا چکا ہے، اسی نئی کتاب میں مذہبی، فقہی، عقلی اور تاریخی مختلف حیثیتوں سے بحث کرکے اس کو مسلمانوں کے قومی تشخص اور ملی زندگی کے لیے ناگزیر اور اس میں تبدیلی

کو نہ صرف مسلمانوں بلکہ ملک اور حکومت کے نقطۂ نظر سے بھی مضر ثابت کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں شرعی نصوص پر مشتمل احکام اور مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے جواز کے دلائل کی پوری تردید کی گئی ہے اور مسلم ممالک کے ردعمل کا جائزہ اور اسلامی عہد میں غیر مسلموں کے پرسنل لا کے تحفظ کا ذکر اور نکاح، طلاق، خلع، مہر، وراثت اور اوقاف کے فقہی احکام بیان کیے گئے ہیں، آخر میں اسلام میں عورت کا درجہ و مرتبہ اور اس کا دوسرے مذہبوں سے مقابلہ اور مسلم خواتین کی سیاسی، سماجی اور علمی خدمات کا اجمالی تذکرہ ہے، کتاب محنت سے لکھی گئی ہے، اور موضوع پر بہت جامع ہے، لیکن بعض غیر متعلق بحثیں اور کہیں کہیں انداز تحریر جذباتی ہو گیا ہے، عورتوں کے حقوق کے ضمن میں ایک جگہ انکی نبوت کا بھی ذکر ہے، لیکن یہ قول جمہور امت کے خلاف ہے، اور جن کتابوں سے اس کی سند پیش کی گئی ہے ان سے بھی اس کا ضعیف ہونا ہی ثابت ہوتا ہے، صفحہ ۲۴۸ پر زیب النساء کی جن تین تصنیفات کا ذکر ہے ان میں ایک بھی اس کی تصنیف نہیں ہے، مونس الارواح جہاں آرا کی تصنیف ہے، اور زیب التفاسیر دراصل تفسیر کبیر کا فارسی ترجمہ ہے جو اس نے ملا صفی الدین اردبیلی سے کرایا تھا، اسی طرح دیوان اور مخفی تخلص کی نسبت بھی اس کی جانب مستند نہیں ہے، الحسبۃ فی الاسلام ابن قیمؒ کے بجائے ابن تیمیہؒ کا رسالہ ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں "حضرت عائشہؓ کے بارہ میں مولوی سعید انصاری نے سیر الصحابیات میں لکھا ہے کہ وہ لکھنا نہیں جانتی تھیں، لیکن یہ خلاف واقعہ ہے"، حالانکہ یہ بلاذری کے حوالہ سے لکھا گیا ہے جس کا مصنف نے کوئی ذکر نہیں کیا ہے، گو حضرت عائشہؓ کے متعلق اسکے خلاف روایت بھی ملتی ہے، تاہم علامہ سید سلیمان ندویؒ اور مولانا سعید انصاری مرحوم کی تحقیق میں ان کے لکھنا نہ جاننے ہی کی روایت صحیح ہے، جو قرین قیاس بھی ہے، ص ۷۹ تا ۸۱ پر جو آیتیں نقل کی گئی ہیں ان سے مصنف کا مدعا صراحۃً ثابت نہیں ہوتا، آیتوں کے آزاد ترجمہ کی وجہ سے بعض فقروں کا ترجمہ رہ گیا ہے، اور بعض میں غلطیاں ہو گئی ہیں، جیسے لتنذر کا "اشاعت" اور



"اہبطا" کا "رخصت ہو جاؤ" کیا گیا ہے، کلام مجید کی بعض آیتیں غلط نقل کی گئی ہیں، لیکن ان معمولی فروگذاشتوں سے کتاب کی خوبی میں فرق نہیں آتا، شروع میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کا ایک جامع اور پرمغز مقدمہ ہے، جو زیر بحث موضوع پر بڑا مدلل اور بجائے خود نہایت کافی و وافی ہے۔

**حیات ذاکر حسین** مرتبہ جناب خورشید مصطفےٰ صاحب رضوی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۴۰۰ مجلد مع گردپوش، قیمت مجلد عشے، پتہ: مکتبہ برہان اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶

یہ کتاب ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زندگی ہی میں لکھی گئی تھی، اس میں ان کے خاندانی حالات اور ابتدائی دور سے صدر جمہوریہ ہونے تک کے جملہ واقعات و حالات کو قلمبند کیا گیا ہے، اور انکی جامعہ ملیہ کی صبر آزما زندگی، جامعہ اور علی گڑھ میں ان کے مشاغل و خدمات اور گورنر، نائب صدر اور صدر کی حیثیت سے ان کے کاموں کی مفصل روداد بیان کی گئی ہے، جو دلچسپ اور بعض حیثیتوں سے سبق آموز بھی ہے، ہندوستان کے گذشتہ نصف صدی کے واقعات سے عموماً اور علی گڑھ اور جامعہ ملیہ کی علمی و تعلیمی تحریکوں سے خصوصاً ذاکر صاحب کا بڑا تعلق رہا ہے، انکی سیرت و شخصیت کے آئینہ میں یہ تصویر نمایاں نظر آتی ہے، مرتب نے انکی زندگی کا دوسرا رخ بھی ایک حد تک پیش کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً علی گڑھ کی وائس چانسلری اور ملک کی صدارت کے زمانہ کے بعض واقعات کی بنا پر ان پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں، ان کا بھی اس میں ذکر آ گیا ہے، غالباً اردو میں ذاکر صاحب پر یہ پہلی مستقل کتاب ہے اور اس سے انکی رنگا رنگ اور دلآویز شخصیت کے جلوے پوری طرح سامنے آجاتے ہیں، شروع میں رشید احمد صدیقی صاحب کا پیش لفظ اور آخر میں ذاکر صاحب کے اردو، انگریزی مضامین اور کتابوں کی فہرست بھی دی گئی ہے،

**صبوحی** ۔ مرتبہ جناب مہرچند کوثر صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۴۴، مجلد مع گردپوش، قیمت تے ۵۰ پیسے، پتہ: پنجاب اردو اکاڈمی، 21-D-3349، چنڈی گڑھ۔
(۲) نوبہار صابر۔ مرتبہ آشرم۔ ڈالگھو مزرعہ پٹیالہ۔

جناب مہرچند کوثر پنجاب کے خوشگو شاعر ہیں، گو انکی شاعری کی عمر طویل نہیں ہے، لیکن انکے کلام میں پختگی اور شائستگی پائی جاتی ہے، شاعر کو اصلی مناسبت غزل سے ہے، چنانچہ اس مجموعہ کا بیشتر حصہ غزلیات ہی پر مشتمل ہے انکے تغزل میں رنگینی ولطافت، معنی آفرینی اور طرز ادا کی دلکشی نمایاں ہے، ان کے دردمند دل نے حسن وعشق کے معاملات میں زندگی کے مسائل وحقائق کی جھلک اور غم عشق میں آلام روزگار کی تلخیاں بھی شامل کردی ہیں، اس طرح ان کی آپ بیتی میں جگ بیتی کی شان پیدا ہوگئی ہے، آخر میں بعض قومی وہنگامی مسائل پر چند نظمیں ہیں، ان سے بھی مصنف کی قادر الکلامی اور ملک وطن دوستی کا پتہ چلتا ہے، امید ہے کہ یہ مجموعہ اہل ذوق میں مقبول ہوگا۔

**سوئٹ سفارتخانے میں** ۔ مترجمہ جناب مخمور سعیدی، پریم گوپال متل صاحبان، وسعیدہ انجم صاحبہ، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۷۶، قیمت عہ/ ناشر نیشنل اکاڈمی ۹۔ انصاری مارکیٹ، دریا گنج۔ دہلی ۶

نیشنل اکاڈمی دہلی نے کمیونزم کے اصلی خدوخال کو دکھانے کیلئے متعدد مفید کتابیں شائع کی ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک دلچسپ کڑی ہے، جو برامین تھین ایک روسی ڈپلومیٹ اور سوئٹ نمایندے الیکزنڈر کزناچیف کے ان تجربات پر مشتمل ہے جو ان کو وہاں کے روسی سفارت خانے کے اندر اور باہر پیش آئے، مصنف نے دکھایا ہے کہ ایک طرف تو سوئٹ محکمہ سفارت برمی حکومت سے دوستانہ معاہدے اور خوشگوار معاملات طے کرتا ہے، دوسری طرف اسکا خفیہ جاسوسی ادارہ کمیونسٹوں کو منظم کرنے، ملک میں بغاوت اور انارکی پھیلانے اور حکومت کو ختم کرنے کی پراسرار سازشیں کرتا رہتا ہے اور ان تخریبی کارروائیوں کا ذمہ دار وہاں کی کمیونسٹ پارٹی کو قرار دیدیا جاتا ہے، ممکن ہے مصنف کے بعض بیانات میں مبالغہ ہو لیکن مجموعی حیثیت سے حقیقت پر مبنی معلوم ہوتے ہیں، اور ان سے سوئٹ یونین کی کمیونزم کو پھیلانے کی خفیہ اور منظم جدوجہد کا حال بھی معلوم ہوتا ہے اور برما کے بعض معاشرتی حالات اور مشہور تاریخی یادگاروں کے متعلق معلومات بھی فراہم ہوتے ہیں۔

"ض"



نمبر ۱۰۵ ماہ ربیع الاول ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۷۰ء عدد ۵

## مضامین



---